

ڈاکٹر
عبادت بریلوی

کلا

کلا

کلا

ڈاکٹر عبادت بریلوی



غالب کا فن



ادارۂ ادب و تنقید، لاہور

تصنیف : غالب کافن
 مصنف : ڈاکٹر عبادت بریلوی
 ناشر : ادارۂ ادب و تنقید لاہور
 سرورق : سید انور حسین شاہ نعیم رقم
 اہتمام : سید محمد ابراہیم خوش نویس لاہور
 مطبع : لاہور آرٹ پریس، لاہور
 جلد سازی : مدنی بک بائینڈنگ باؤس۔ لاہور
 قیمت :

روپے
 ادب و تنقید لاہور
 لاہور ۱۹۸۸ء





مزاجِ دہانِ فکر و فنِ غالب

ہولہا گسرائے قدو

جنابِ پروفیسر حمید احمد خاں صاحب

کی شذر

خوشا لطافتِ اندازہٴ ادافی

تجسّے نزاکتِ اندازہٴ مدعا دانی

(غالب ہے)



ترتیب

۷	پیش لفظ	
۱۱	اہمیت	۱
۱۶	عوامل اور حرکات	۲
۳۱	موضوع اور فن کی ہم آہنگی	۳
۶۹	وزن و آہنگ	۴
۱۰۵	روایت کے اثرات	۵
۱۲۹	علامات و اشارات	۶
۱۳۵	رمزیت اور ایمائیت	۷
۱۶۵	تصویرکاری اور پیکر تراشی	۸
۲۱۷	زبان و بیان	۹
۲۶۲	ماحصل	۱۰
۲۷۹	اشاریہ	

پیشے لفظ

غائب ایک عظیم شاعر ہیں اور ان کی اس عظمت کا راز اس میں ہے کہ انہوں نے اردو شاعری کی روایت میں ایک نئی روح پھونکی ہے۔ اس کو ایک نئی زندگی دی ہے۔ اس میں ایک نیا انقلاب پیدا کیا ہے۔ تبدیلی کی ایک نئی ہر دوڑائی ہے۔ اس کو نئے راستوں پر گامزن کیا ہے۔ نئی منزلوں کی طرف بڑھایا ہے بلکہ نئے آسمانوں پر پرواز سکھائی ہے۔ وہ اردو شاعری کے مجتہد بھی ہیں مجدد بھی۔ ان کا بنیادی موضوع انسان اور انسانیت ہے۔ انہوں نے اسی انسان اور انسانیت کے بنیادی انفرادی اور اجتماعی مساوت و مساوی کو بڑی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ اپنی شاعری میں سمایا ہے۔ اس طرح اردو شاعری ان کے استوں ایک آفاقی رنگ اور ایک بکری آہنگ سے

آشنا ہوئی ہے اور اس کو ایک ذہن و شعور ملا ہے۔ وہ
 ائمہ کے پچھلے فلسفی شاعر ہیں۔ لیکن ان کی شاعری صرف فلسفہ نہیں
 ہے۔ اس فلسفے کو انہوں نے تجربے کے سانچے میں کچھ اس طرح
 ڈھالا ہے اور تخلیق کے رنگوں سے اس کو کچھ اس طرح سجاا ہے
 کہ اس میں حسن و جمال کی ایک دنیا آباد ہو گئی ہے۔ اور سن و
 جمال کی اس دنیا نے انہیں ایک بہت بڑا فن کار اور ایک
 اعلیٰ درجے کا خالقِ جمال ثابت کر دیا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ گزشتہ سو سال میں غالب کی شخصیت
 اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بیسیوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور
 سینکڑوں مضامین و مقالات قلم بند کئے جا چکے ہیں لیکن ان کی
 فن کاری اور تخلیقی جمال کے پہلو پر ان کتابوں اور مقالوں میں
 کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی ہے۔ کہیں کہیں ان کی فن کاری کا
 ذکر ہوتا ضرور ہے۔ اس کی تحسین و تشریف میں چند فقرے اور
 جملے بھی لکھے گئے ہیں لیکن ان پہلوؤں کا تنقیدی تجزیہ کسی
 طرح ہونا چاہیے تھا، نہیں ہو سکا ہے غالب کی شخصیت اور
 شاعری کے مستقل تحقیقی اور تنقیدی تحریروں کا مطالعہ کرتے
 وقت یہ کمی کا نسخہ کی طرح کھٹکتی ہے۔

اس احساس ہی نے میرے دل میں اس خیال کی شمع
 روشن کی کہ میں غالب کی تخلیقی جمال کے عوامل اور محرکات کا
 سراغ لگادوں اور اس کے مختلف عناصر کا تنقیدی تجزیہ کروں۔
 یہ کتاب "غالب کا فن" ان کے اسی تخلیقی جمال کے عوامل و

حرکات کی تلاش و جستجو کی ایک داستان اور اس کے مختلف عناصر کے تنقیدی تجزیے کی ایک کہانی ہے۔

اس کتاب کو آسانی کے خیال سے دس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں غالب کے فن کی اہمیت کا منظر سا بیان ہے۔ دوسرے باب میں ان عوامل اور حرکات کی تفصیل ہے جن کے باعث غالب کے فن کی تشکیل ہوئی ہے۔ تیسرے باب میں موضوع اور فن کی اس ہم آہنگی کا ذکر ہے جس سے غالب کا فن پہچانا جاتا ہے۔ چوتھے باب میں وزن و آہنگ کی تفصیل ہے اور اس حقیقت کا حائزہ ہے کہ اس وزن و آہنگ نے غالب کے فن میں کیا کام کیا ہے۔ پانچویں باب میں اس بات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ روایت کے اثرات نے غالب کے فن کو کس طرح متاثر کیا ہے اور اس نے ان کی شاعری میں کیا صورتیں اختیار کی ہیں۔ چھٹے باب میں علامات و اشارات کے جہازاتی پہلوؤں پر تنقیدی بحث ہے۔ ساتواں باب رمزیت اور ایمائیت کی جہازاتی اہمیت کی وضاحت کرتا ہے۔ آٹھویں باب میں غالب کی تصویر کاری، پیکر تراشی یا امیجری پر تفصیل بحث کی گئی ہے۔ اور ان کی شاعری کے بعض ایسے پہلوؤں کی نقاب کشائی کی گئی ہے جن کی بدولت ان کا فن ایک اچھا خاصا نگارخانہ بن گیا ہے۔ نویں باب میں زبان و بیان کے جہازاتی پہلوؤں کا تنقیدی حائزہ لیا گیا ہے اور دسویں باب میں اختصار کے ساتھ اس تنقیدی بحث سے نکلنے والے اُن

تمام نتائج کو یک جا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن سے
 نہ صرف اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ غائب کا سا بلند پایہ
 خالق ہمال اور اعلیٰ پائے کا فن کار اردو شاعری میں کوئی
 اور پیدا نہیں ہوا بلکہ یہ حقیقت بھی واضح ہوتی ہے کہ غائب
 کے بعد جتنے بھی اہم شاعر گذرے ہیں انہوں نے کسی نہ کسی
 ذریعے سے غائب کا اثر قبول ضرور کیا ہے۔

غائب کے فن اور ہدایتی پہلو کے اس تنقیدی جائزے
 کو گنتی نہیں کہا جا سکتا۔ میں نے اپنی سی پوری کوشش ضرور
 کی ہے کہ غائب کے فن کے تمام خدوخال اس جائزے سے پوری
 طرح نمایاں ہو کر سامنے آسکیں۔ اس کوشش نے اس تنقیدی
 جائزے کو مکمل اور بھرپور نہ سہی لیکن ایک مستقل اور بڑی
 حد تک صحیح مطالعہ ضرور بنا دیا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ
 اس میں تفصیل و جزئیات کے عناصر نسبتاً زیادہ نمایاں ہو گئے
 ہیں۔ بحثیں بھی طویل ہو گئی ہیں۔ تجزیے میں بھی کچھ پھیلاؤ
 پیدا ہو گیا ہے۔ اشار کا انتخاب بھی کچھ بڑھ گیا ہے۔
 لیکن اس قسم کے تنقیدی اور تجزیاتی مطالعے میں ان پہلوؤں
 کا پیدا ہونا ایسی کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ تنقیدی خیالات
 کی وضاحت کے لئے اشار کا انتخاب ضروری ہوتا ہے۔ اس
 کو مختصر بھی کیا جا سکتا تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا ہے۔
 کیونکہ میرے خیال میں اشار کے انتخاب کی تنقیدی اہمیت
 بھی کچھ کم نہیں ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ اس قسم

کے تنقیدی جائزے میں شاعر کے اشعار دلوں میں نور اور ہلکوں میں سرور پیدا کرنے کا سامان بھی فراہم کرتے ہیں۔ تنقید اس معاملے میں بے بس ہے۔

اس تنقیدی جائزے میں جو رنگ و آہنگ ہے وہ اردو تنقید میں عام نہیں ہے۔ انگریزی اور بعض دوسری زبانوں میں تو اس قسم کے تنقیدی جائزوں کی خاصی فراوانی ہے لیکن اردو میں ان کی کوئی اہم روایت نہیں ملتی۔ اس طرح دیکھا جائے تو اس تنقیدی جائزے کی حیثیت ایک تجربے کی ہے۔ تجربہ نقشِ اول سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس نقشِ اول میں غالب کے فن اور اس کے جالیات پہلوؤں کی طرف بعض چند اشارے کئے گئے ہیں۔ صرف اس خیال سے کہ ان اشاروں کو سامنے رکھ کر دوسروں کو اس راستے پر گامزن ہونے آگے بڑھنے اور نئی منزلوں سے ہلکار ہونے، بلکہ نئے آسمانوں پر پرواز کرنے کا موقع ملے گا۔

اور اس طرح وہ کارنامے جو غالب نے اردو شاعری میں انجام دیے ہیں اور ان کے ہاتھوں غفلت کی جراثیم اس کی روایت کے شبستانوں میں فروزاں ہوئی ہے وہ اردو تنقید کے اوراق کو بھی اپنی مسکراہٹ سے جگمگائے گی۔

اهمیت

غالب کی حیثیت اُردو شاعری کے آفاق پر ایک ایسے درخندہ ستارے کی ہے جس کی دل نشیں ستر ستر اہٹ ہر حال میں دلوں کو بھاتی ہے ۔ وہ صبحِ مہنوں میں عظیم شاعر ہیں ۔ اور ان کی اس عظمت کا راز اس میں ہے کہ وہ انسانی زندگی کے نشیب و فراز کو شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں ۔ اس کے مختلف پہلوؤں کا گہرا شعور رکھتے ہیں ۔ اس کے بنیادی معاملات و مسائل پر غور و فکر کرتے ہیں ۔ اس کی ان گنت گھٹئیوں کو بھلاتے ہیں ۔ انسان کو اس کی عظمت کا احساس دلاتے ہیں ۔ اس کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھاتے ہیں اور نظامِ حیات و سوادِ کائنات میں اس کو نئے آسمانوں پر اُڑاتے ہیں ۔ غالب کی شاعری اس اعتبار سے بہت بند ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ ان کی شاعری کے انہیں عناصر نے اس کو عظمت سے بیکار کیا ہے لیکن جس طرح ان کی شاعری میں

ان سب کا انہار و ابلاغ ہوا ہے، وہ بھی اس کو عظیم بنانے میں برابر کا شریک ہے۔

یہ انہار و ابلاغ حسیں و دل آویز ہے۔ اس میں سخن کی ارض اقدار ہیں۔ جمال کے اعلیٰ میار ہیں۔ ان میں بڑی ہی رنگینی اور رحمتائی ہے۔ بڑا ہی پُرکار انداز ہے۔ اس میں شروع سے آخر تک چمکی ہوئی چاندنی کا سا منظر نظر آتا ہے۔ آسمان پر جگمگاتے ہوتے ستاروں کی سی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ کسی شہر میں چراغوں کی سی کیفیت کا سا معلوم ہوتا ہے۔ قدم قدم پر اس میں گل و گلزار سے بکھٹے ہیں۔ کھیاں سی چلتی ہیں۔ پھول سے مسکراتے ہیں۔ جھڑ خانوں سے جگمگاتے ہیں۔ اس میں ربانوں کی سی رنگینی ہے۔ شبستانوں کی سی پُرکاری ہے۔ اس میں رنگ کے طوفان سے آتھتے ہیں۔ فود کے سیلاب سے اُٹھتے ہیں۔ اور جگہ جگہ برسات کے دونوں میں شام کے وقت دور مزب میں آفتاب پر پھولی ہوئی کشفیق کا سا عالم نظر آتا ہے۔

ان باتوں میں شاعرانہ رنگ اور تاثراتی آہنگ مزور ہے لیکن مبالغہ نہیں ہے۔ کیونکہ غالب کی شاعری پڑھنے اور سننے والے کے سامنے یہ اور اسی قسم کے ان گنت پیکروں کو سامنے لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا اثر احساس پر شدید ہوتا ہے۔ وہ ان میں غیر شعوری طور پر ایک ارتعاش کی سی کیفیت پیدا کرتی ہے اور اس ارتعاش کی وجہ سے اس کے پڑھنے اور سننے والے کے ذہن پر اس قسم کی تصویریں ابھرتی ہیں۔

غالب کا انہار و ابلاغ اپنے موضوع کے ساتھ پوری طرح

جم آہنگ ہے۔ ان کے موضوع میں جو دستیں اور گہرائیاں ہیں، اس کا عکس ان کے اقدار و ابلاغ میں بھی نظر آتا ہے۔ اُن گنت عناصر کے امتزاج سے اس کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس میں غالب کے تجربے کی کیفیت، جذبات و محسوسات کا مخصوص آہنگ، اوراک و شور کے نیچے میں پیدا ہونے والا ایک سنجیدہ انداز، ہیمنیڈ اور ہتہ در تہذیبات کے باعث پیدا ہونے والی مخصوص رمزیت اور ایمانیات، عظمت و اشارات، استعارات و تشبیہات، تصویر و پیکر اور الفاظ و زبان اسب ہی کچھ شامل ہیں۔

ان تمام عناصر کے مجموعی اور متوازن امتزاج کا نام غالب کا فن ہے جس میں ایک عظیم اور پہلو دار شخصیت کی عکاسی اور ایک رنگین اور پُرکار تہذیب کی ترجمانی خود حسن و جمال کی اقدار کو چار سپاند لگاتی ہیں۔

عوامل اور محکات



غالب کے مں کو ایک مخصوص ہندسی روت نے پیدا کیا۔
 اس کی نیمہ دھجکی میں وہ ماسٹرٹی و ہندسی اور ذہنی و فکری وحدت
 بھی بر کے شریک میں مں کے ساسے میں مں نے آنکھ کھولی ہے
 اور اسے سفر کی آسانی مں میں ملے کی ہیں وہ غالب کی شخصیت کا
 آئینہ ہے اور اس آئینے میں نہ صرف ان کی شخصیت کے خدوخال
 پوری طرت سے نمایاں نظر آتے ہیں بلکہ ان حالات کی تصویر بھی دکھائی
 دیتی ہے جن کے باعث غالب کی شخصیت کا بیوہ تیار ہوا ہے۔
 یہ ایک اتنی حوالی بات ہے کہ غالب اس تہذیب کی آخری
 یادگار۔ میں جس کو اس بر عظیم میں مں نے پیدا کیا اور بدولت چڑھایا
 تھا اس میں تشبیہ نہیں کہ محمد اکبر ہی اور محمد شاہجہانی میں یہ تہذیب
 اپنے سراج شباب پر نظر آتی ہے۔ اور نگ تہذیب عالمگیر کے زمانے

میں بھی کم و بیش یہی عالم رہتا ہے لیکن اس کے بعد اس میں انحطاط و زوال کے آثار رونما ہونے لگتے ہیں۔ مسلمانوں کے دورِ آخر میں انحطاط و زوال کا یہ عمل جاری رہتا ہے اور غالب کے عہد تک آتے آتے تو یہ عمارت انتہائی بوسیدہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ البتہ اس کے باوجود در زبانِ حال سے یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ یہ ایک عظیم اور شاندار عمارت تھی۔ چنانچہ جو رُگ اس عمارت کے وارث تھے، ان کے یہاں اس کی عظمت کا احساس بڑھ جاتا ہے، اور جو روایات اس کے سامنے ہیں، وہی بڑھی اور پروان چڑھی تھیں، ان کی اہمیت کے احساس و شعور میں کچھ اس درجہ اضافہ ہو جاتا ہے کہ وہ انہیں سینے سے چھٹاتے رہتے ہیں اور کسی حال میں بھی اس کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

غالب اس صورتِ حال کے صحیح ترجمان اور عکاس ہیں۔ انیسویں صدی کی دہائی میں سببِ تسلطِ سیاسی میدان کو تقریباً چھوڑ چکے تھے اور منسل بادشاہ کی حکومت صرف دلِ تھکے کے اندر محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ غالب اور ان کے ہم عصروں نے تہذیبی روایت کی اس شمع کو فروزاں رکھا جس نے ماضی میں اس بزرگوار کی پوری زندگی کو رنگین اور پُرکار بنا دیا تھا۔ غالب کے زمانے میں اس تہذیبی روایت کی قدیں بھی اپنے معراجِ کمال پر نظر آتی ہیں اور یہ صرف غالب اور ان کے بعض ہم عصروں کا کارنامہ ہے کہ حالی نے اس دور میں ایک دگر پھر عہدِ اکبری اور عہدِ شاہجہانی کی جھلک دکھائی ہے۔

اس تہذیب میں جو جذبی اور ترقی ہے، جو رنگینی اور پُرکاری ہے، جو جگمگاہٹ اور تابانی ہے، جو رُس اور رعنائی ہے، اس

کو تاج مل ، قلندر احمد جامع مسجد کے در و دیوار اور فیضی مٹری
 فطیری اور بیدل کے اشعار میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ غالب کے فن
 اور ان کی شاعری کے جمالیاتی اظہار میں بھی اس تہذیبی روایت کی
 جھلک اپنی تمام جلوہ سالانہوں کے ساتھ بے نقاب دکھائی دیتی ہے۔
 ان کے فن میں جو ایک رنگینی اور پرکاری ، جگمگاہٹ اور تابانی اس
 اور دعائی ہے ، وہ اسی صورتِ حال کا نتیجہ ہے۔ غالب کے یہاں اس
 تہذیبی روایت کے گہرے اثرات صرف اس وجہ سے نظر آتے ہیں کہ
 اس دور میں اس روایت کی عظمت کا احساس افراد میں کچھ زیادہ ہی
 شدید ہو گیا تھا۔ انقطاع و زوال جب انتہا کو پہنچ جاتے تو یہی صورت
 حال پیدا ہوتی ہے۔ غالب اس کے یکے علم بردار ہیں اور ان کا فن اور
 جمالیاتی اظہار اس کا صحیح آئینہ دار !

یہ تہذیبی روایت بقول حالی صد اکبری اور محمد شاہ بھانی کی یاد
 اس وجہ سے بھی دلاتی ہے کہ اس زمانے میں اپنے آپ کو پانے اور
 اپنی سیاسی اور تہذیبی عظمت کے جگر محنت محنت کو ایک دفتر پھر
 جمع کرنے کی کوششیں بعض ایسی تحریکوں کی صورت میں موجود تھیں جن
 کی نوعیت بہ یک وقت سیاسی اور معاشرتی بھی تھی اور دینی و
 تہذیبی بھی۔ ان میں مولانا سید احمد بریلویؒ اور مولانا اسماعیل شہیدؒ کی
 تحریک ہند کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس تحریک نے مجموعی
 طور پر اس معاشرے میں جو ماحول پیدا کیا تھا ، اس کے اثرات
 خاصیت تک پر موجود تھے۔ غالب کو مولانا سید احمد بریلویؒ کی تحریک
 سے اختلاف تھا۔ وہ مولانا فضل حق خیر آبادی کے دوست اور ہم خوا

تھے لیکن جوفانی اور دورد انگیزی کی جوفضا اس تحریک نے اس زمانے کی دہائی میں پیدا کر دی تھی۔ اس نے غالب کو بھی متاثر کیا اور ان کے فن میں باوجود غم عشق، غم حیات اور غم روزگار کے پیدا ہونے والی اہم انگیزی کے۔ وہ جو ایک دورد انگیزی اور جوفانی تھی ہے اور اس کے نتیجے میں ایک شگفتگی اور شادابی کا جو احساس ہوتا ہے وہ اسی تحریک کی آتش افشانی اور شد سانی کا نتیجہ ہے۔ غالب کے فن اور ان کے جمالیاتی اظہار میں نشاط رنگ اور طریہ آبنگ کی جو چاندنی سی مسکاتی ہے، اس کو بھی باواسطہ طور پر جوشن اور دوسے کی اس فضا ہی نے پیدا کیا ہے جو ان نیم مذہبی اور نیم سیاسی تحریکوں کے باعث وجود میں آئی تھی۔

غالب کے ادبی ماحول نے بھی ان کے فن اور جمالیاتی اظہار کی تشکیل و تعمیر میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اردو غزل میں غالب سے قبل میر کی قیادت کی ہوئی روایت شاید سب سے زیادہ استوار تھی۔ غالب نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ میر کی اسادی ان کے نزدیک مسلم ہے۔ وہ انہیں بڑا شاعر مانتے تھے اور ان کے خیال میں جو ان کی اسادی کو تسلیم نہیں کرتا وہ خود بے بہرہ ہے۔

رہنے کے مہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

غالب پناہ عتیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو مستغیر میر نہیں

لیکن میری روایت کے اثرات غالب کے فنی ہیں۔ ہونے کے برابر ہیں۔ میر کے جملے مروج کی بنیاد کی تختی میں پیدا ہونے والی نقابیت ہے۔ ان کا فنی جڑ ہی مستند فنی ہے۔ ملکہ اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ وہ اصل مستند ہے۔ اس میں کوئی تکیہ نہ تھی اور نہ وہ ترادف تر کینیت نہیں ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ وہ ایک ایسے دور کی پیداوار ہے جس میں خود کوئی خارجی کینیت نہیں تھی۔ زندگی کا انداز بدل گیا تھا۔ سوائے زمانہ نے اس کی صورت بگاڑ دی تھی لیکن انہوں نے اس تبدیلی کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے۔ کیسے ہو رہا ہے، اس کے نتائج کیا ہوں گے اور اس سے وہی بچانے کے لئے کیا کرنا چاہئے؟ شاید یہی وجہ ہے کہ اس فنی روایت میں بے باکی نہیں ہے۔ قہری اور تندی نہیں ہے۔ شگفتگی اور تھلاہی نہیں ہے۔ بندی اور بلند آہنگی نہیں ہے۔ برخلاف اس کے ایک جواب کی سی کینیت ہے۔ ایک بہتر رویہ ہے اور ایک شدید ایئر رنگ اور تحریر آجنگ ہے۔ غالب نے اس روایت سے کوئی خاص اثر قبول نہیں کیا ہے۔

ابتر میر کی روایت سے ہی ہوئی ایک اور روایت شعور و خیال میں ایسی ہے جس کے اثرات کی جھلک کہیں کہیں غالب کے فنی میں نظر آتی ہے۔ یہ روایت شگفتگی، ہنسا اور جرات کی قلم کی ہوئی روایت ہے۔ اس میں نسبتاً زیادہ شگفتگی اور تھلاہی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ وہی معمولی اور دورانیہ قہری قہر آتی ہے۔ ایک قہار رنگ و آہنگ

ہے کہ اس کے اثرات ان کے فی پر کیا ہوئے ؟ ان کے فی میں وہ جو ایک برتری کا احساس ملتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے۔ غالب کے فی میں قہر نہیں ہے۔ وہ غزلیں میں بھی اپنے آپ کو پامال نہیں کرتے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش فی انہما سے بھی ان کے یہاں جاری رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں گوی اور دوستی دونوں کا احساس ہوتا ہے اور ساتھ ہی قسمت پسندی بھی نظر آتی ہے۔ لکھنا بھی اپنے آپ کو نمایاں کرتا ہے۔ اور یہ سب ان کی نفسی خصوصیت ہیں جو ان کی شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کے فی میں بھی اپنا جلو دکھاتی ہیں۔

سوئی کی طرح غالب کی جوانی ہماری طرح دیوانی نہیں تھی۔ ستم پیشہ ڈامنی سے عشق کرنا اور میں پر مڑنا اس کو مادر لکھنا جس کا ذکر غالب نے اپنے خطوط میں جگہ جگہ کیا ہے اس کی اہمیت یہی کہ زیادہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی چھاپ بھی ان کے فی میں ایسی کچھ زیادہ نمایاں نظر نہیں آتی۔ اس سے کہیں زیادہ اثر تو اس کھنڈ سے ہوتا ہے کہ ان کے فی میں دکھائی دیتا ہے جو بچپن میں ان کے مزاج کا بڑھ چکا تھا۔ غالب کے فی میں اس کے اثرات روایت شکنی ہے یا قیود سے کو خلاصی ایک طرح کے احساس آزادی اور کہیں کہیں سنجیدگی اور ثبات سے افزائش کی منت میں ملتا ہے۔ غالب روایت کے پابند تھے مگر اپنے فی میں انہوں نے عملی طور پر روایت کے بہت سے بھروسے کو توڑا ہے۔ ان کے فی میں شروع سے آخر تک بے باکی سے بات کہنے اور کسی کی پروا نہ کرنے

کا جو۔ جہاں ہے۔ اس کا بے وجہی احساس آزادی ہے جو ہمیں میں
 ہے راہ روی کی زندگی بسر کرنے کی وجہ سے ان کی شخصیت کا
 لازمی جز بن گیا تھا۔ ان کے فن میں جگہ جگہ احساس مزاج کا جو
 میلان تھا ہے اور ظرافت کی جو بھلیاں سی کو مذاق نظر آتی ہیں اس
 کے پیچھے بھی ان کے ہمپن کی زندگی کا وہ زمانہ ہے جب سنجیدگی
 اور ثقاہت کی طرف ان کی توجہ نسبتاً کم ہو گئی تھی۔

زندگی کا قانون ہے کہ رومانیت اور رومان پسندی ایسے
 لوگوں کا مقتدر بن جاتی ہے۔ کیونکہ وہ زندگی کی ان منزلوں سے
 گذر کر خیالات کی دنیا میں بسا لیتے ہیں اور تخیل کے سہارے
 بچنے کا سامان کرتے ہیں۔ شاید اس وجہ سے کہ زندگی سے جو تعلق
 وہ کرتے ہیں وہ پڑے نہیں ہوتے۔ اس لئے وہ تخیل کے سہارے
 ان کی طرف پکٹتے ہیں اور پھر یہی ان کا شمار بن جاتا ہے۔ غالب کو
 بھی یہی صورت حال ہمیشہ آتی ہے۔ جس صاحب سے انہوں نے
 زندگی کو بسر کیا ہے۔ اس نے ان کے مزاج میں رومانیت اور
 رومان پسندی پیدا کر دی ہے۔ چنانچہ اس کے اثرات ان کے فن میں
 بھی نمایاں ہوئے ہیں۔ ان کے یہاں جو بلند پروازی، بلند آہنگی
 رنگینی اور رنگین کاری ہے وہ اسی رومانیت اور رومان پسندی کا
 نتیجہ ہے۔ اسی کے سہارے وہ اپنے فن میں بھی وادئی خیال کو
 اس طرح مستانہ طے کرتے ہیں کہ باز نشست کا مدعا تک ان کے
 یہاں باقی نہیں رہتا۔

مستازے کروں ہوں رو و لوحی خیال
کا بازگشت سے ناز ہے دھما بھے

رومانی فن کار تخیل کے رنگوں سے حسین دنیا میں بناتا ہے اور اسے اپنی شاییت پسندی سے سجاتا ہے۔ لیکن اس کی یہ شاییت پسندی اسے ایسے چکر کے بھی لگاتی ہے کہ وہ ذہنی طور پر ہولناں ہو کر زندگی سے بیزار ہونے لگتا ہے اور اس زندگی کی ہر چیز اسے بے اساس نظر آنے لگتی ہے۔ اس صورت حال کا رد عمل اس کے یہاں غم پسندی کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں اس کے فن میں ایک کنک کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اپنا غم، انسان اور انسانیت کا غم، زمانے کا غم، سب مل کر اس کے فن میں ایک گداز کی کیفیت کو ابھارتے ہیں۔ غالب کے فن میں بھی گداز کا یہ رنگ اوجہ اپنے نشاطیہ آہنگ کے خاصا گہرا نظر آتا ہے۔

ایک ایسا فن کار جو اس منزل پر پہنچ جائے۔ اس کے یہاں فکری عنصر کا نمایاں ہونا لازمی ہے۔ اس فکری عنصر سے اس کے یہاں بنیدگی، گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی ہے۔ غالب کے یہاں بھی یہ فکری عنصر نمایاں ہوا ہے اور اس کے نتیجے میں ان کے فن میں بھی بنیدگی اور گہرائی کے وہ عناصر رونما ہوتے ہیں جن کے بارے میں شاید یہ کہنا بے جا نہیں کہ وہ ان کے فن کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔ غالب فکری پہلوؤں کے اظہار و ابلاغ میں نہ جانے کہاں کہاں پہنچتے ہیں اور نہ جانے کتنے نئے آسمانوں پر پرواز کرتے

ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن کے ہاتھوں ان گنت نئے پسکوں کی تخلیق ہوتی ہے۔ اُن گنت نئی علامتیں وجود میں آتی ہیں۔ ایک لطیف سا ابہام صحت اختیار کرتا ہے اور ایک نہایت ہی حسین رمزیت اور ایمائیت اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ کیونکہ اس کے بنیہ نظری پہلوؤں کی دستوں کا ایک ایسی صنف میں سامنا جس کا عرف محدود ہونا ناگہی اور محال ہے۔

غالب نے فارسی شاعری کی روایت کے سلسلے میں آنکھ کھولی اور اسی روایت کے سائے میں اُن کا ذہنی نشوونما ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے اہم شاعروں کے اثرات اُن کے فن پر بڑے گہرے نظر آتے ہیں۔ مثلاً بیدل، معنی، غموی، نظیری وغیرہ کے اثرات کی چھاپ ان کے فن میں جگہ جگہ نمایاں نظر آتی ہے۔ بیدل کی مشکل پسندی اور گہرائی، غموی کی بند مینائی اور رنگینی، نظیری کی پُرکاری، غموی کی نزدیکی کے بے شمار رنگوں نے بل کر غالب کے فن کو ایک اچھی خامی تو سس قزح بنا دیا ہے۔

عزمن یہ تہذیب، معاشرتی، ذہنی اور فکری عوامل اور محرکات تھے جن کے ہاتھوں غالب کے فن کی عمارت تعمیر ہوئی اور جس میں اس تمام پہلوؤں کے اثرات نے اپنے حسین امتزاج سے کچھ ایسی شان و شکوہ کی کیفیت پیدا کر دی ہے جو عام حالات میں ذرا مشکل ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

غالب اس اعتبار سے جہاں تک ان کی تزکیہ کا تعلق ہے ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔

وضع اور فن کی ہم آہنگی

ہیسا کہ اس سے قبل بھی اشارہ کیا جا چکا ہے غاب کا انظار و
 ابلاغ اپنے موضوع اور مواد کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے۔
 ان کا فن خیال کا اور خیال فن کا پابند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں
 کو ایک دوسرے سے جیلندہ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ ہم ان کو خانوں
 میں نہیں بانٹ سکتے۔ غاب نے تو ان دونوں میں ایسی مناسبت اور
 ہم آہنگی پیدا کی ہے کہ وہ آپس میں پوری طرح خیر و شر معلوم ہوتے
 ہیں۔

غاب کی شاعری میں موضوعات کا بڑا تنوع ہے۔ خیال کی بڑی
 وسعتیں ہیں۔ وہ مواد کے اعتبار سے بڑی بھرپور شاعری ہے۔
 زندگی اس پر حاوی ہے اور وہ خود زندگی پر حاوی ہے۔ اس میں
 محسن ہے، محسن پرستی ہے، عشق ہے، عاشق ہے، انسان ہے، انسانیت

ہے ، انسان دوستی ہے ، انسانیت پرستی ہے ، سیاست ہے ، معاشرت ہے ، تہذیب ہے ، ثقافت ہے ۔ مومن اس میں کم و بیش وہ ہر چیز ہے جو زندگی میں ہے یا ہو سکتی ہے اور اگر نہیں ہو سکتی تو پھر اس کی جگہ کیا ہو سکتا ہے یا کیا ہونا چاہئے ۔ غالب نے ان سب کی تفسیر کی ہے اور ان کے مختلف پہلوؤں کی تفصیل پیش کی ہے ۔ اور اس طرح اپنے متنوع تجربات کو ظاہر کیا ہے کہ خود ان کے فن میں بھی تنوع کی خصوصیت پیدا ہو گئی ہے ۔ چنانچہ ان کے یہاں یکسانی اور یک رنگی نہیں ملتی ۔ برخلاف اس کے ایک رنگا رنگی کا احساس ہوتا ہے ۔

حسن اور حسن پرستی غالب کی شاعری کا ایک اہم موضوع ہے ۔ انہوں نے اس حسن اور حسن پرستی کو انسانی زندگی میں بڑی اہمیت دی ہے ۔ ان کے یہاں اس کا ایک مکمل نظام ملتا ہے ۔ انہوں نے اس کا رشتہ عشق و عاشق سے بھی جوڑا ہے اور انسانی زندگی کے اس اہم پہلو کی بھی حقیقت سے بڑی بھرپور ترجمانی کی ہے ۔ ان کی شاعری میں ان موضوعات کا پتہ اچھا خاصا بھاری ہے ۔ بقول عید احمد خان :-

” غالب کے اردو اور فارسی کلام میں حسن و عشق کو ایک نمایاں جگہ حاصل ہے ۔ قہاد کے لحاظ سے پورے کلام میں اس مضمون کے اس شمار آدھے نہیں مگر ایک تہائی کے قریب مزدور ہوں گے ۔ ان اشعار میں وہی تنوع جدت طرازی اور نکتہ آفرینی نظر آتی ہے جو دیوان اور کلیات کے دوسرے مضامین کا اختیار خاص ہے ۔ اگر

مرزا غالب اپنے کلام کا صرف یہی ایک حشر چھوڑ جاتے تو بھی ان کا شمار دنیا کے بڑے شاعروں میں ہوتا۔ ان اشار میں حسن رنگا رنگ طبعات کے بند دروازے ہی نہیں کھلتے۔ ان میں شاعری کی ایک نئی دنیا کا انکشاف ہے۔ اس دنیا کی آب و ہوا ہر طبیعت کو سازگار نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے لیکن اس کی وسعت اور بے قلمونی کا یہ عالم ہے کہ ہر موقع کی حاجت سے دلکشا مناظر بہ کثرت ملتے ہیں۔ انسانی فطرت کے تمام محدود پہلو جذبہ عشق کے ماتحت جس جس طرح نمودار ہو جاتے، پھیلنے اور ڈھلنے ہیں۔ اس کی ترجمانی میں شاعر نے اپنا تمام جوش و خروش اور پورا ذہنی قلم صرف کیا ہے۔
(غالب کی شاعری میں حسن و عشق - فقیر غالب)

غالب کی شاعری میں حسن کا بیان صرف خارجی ظاہری سے نہیں ہوا ہے۔ اس میں تو مشاہدہ اور محسوسات دونوں کے اثرات نظر آتے ہیں اور پھر ان کا ٹکڑا شور بھی اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ان کے فن میں ایسی منزلیں بھی آتی ہیں جب حسن کے بیان میں حقائق کی تلاش و جستجو شروع ہو جاتی ہے۔ یہاں پہنچ کر حسن صرف حسن انسانی تک محدود نہیں رہتا۔ کائنات کا حسن بھی انہیں اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ چنانچہ وہ منظر فطرت کو حیرت سے دیکھتے ہیں اور اس طرح غلیظ خیال کے لئے اپنے آپ کو آمادہ کرتے ہیں۔ اور ان کی فکر عشق حقیقی تک رسائی حاصل کر کے ایک غلیظ

انداز و اسلوب کو ان کے فنی ہیں نمایاں کر دیتی ہے لیکن یہاں بھی ان کے اظہار و ابلاغ کی طرح داری اور باکین کو شیش نہیں لگتی۔ حسنِ حسن کے حقیقت اور تنوع پہلوؤں کے بیان میں بھی غائب نے اگرچہ اسلوب کے تنوع اور رنگا رنگی کو باقی رکھا ہے۔ لیکن اس میں ہر جگہ ان کی جمال آفرینی اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔ حسن، حسن پرستی یا محبوب کے حسن اور حسنِ عمل کے موضوعات پر یہ اشعار ان کی اس جمال آفرینی کے بہترین نمونے ہیں۔

رنگِ شکستہ صبح بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شکستہ گلِ تازے تاز کا

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کو دیکھا ہی نہیں
زنت سے بڑھ کر نقاب اس شہ رخ کے منہ پر کھٹا

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو
یہ غلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

بھلی اک کو نہ لگنی آنکھوں کے آگے ترکیب
بات کرتے کہ میں ب تشددِ قہر تیر بھی تھا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قہرِ یار کا عالم
میں معتد قہرِ عشق نہ ہوا مست

آئینہ دیکھ اپنا سامنے سے کہ رہ گئے
صاحب کو دل زدینے پر کتنا غور مت

ذکر اس پری دُش کا اور پھر بیان اپنا
بہ گیا رقیب آخر تھا جو راز دہان اپنا

مڑتا ہوں اس آواز پر ہر چند سر آڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

تو اور اُراشیں خیم لاکھ
میں اور اندیشے دور و دراز

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
خیابان خیابان ارم دیکھتے ہیں

ترے سرِ وقامت سے اک قدم آدم
قیامت کے حق کو کم دیکھتے ہیں

ہے تیوری پڑھی ہوئی اندر نقاب کے
جہاں شکی پڑی ہوئی طرف نقاب میں

لوگوں کا ایک چہرہ انا بنگاہ کا
لوگوں کا ایک بگڑنا عتاب میں

شرم کی ادا تے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
میں کھتے بے حجاب کہیں یوں سبب میں

آرائشِ جلال سے غلط نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائمِ نقاب میں

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں سرے زخمِ حبل کو دیکھتے ہیں

اس سادگی پہ کون نہ مڑ جائے اسے سدا
رہتے ہیں اور ہاتھ میں تھوار بھی نہیں

یہ کس بہشتِ شام کی آمد آمد ہے
کہ غیر جلوۂ گلِ مہ گذر میں خاک نہیں

جب وہ جلالِ دل فروز صوبتِ مہر نیم روز
آپ ہی ہو تھلاۃ سوز پر شمع میں مژپھائے کیوں

دشمن غمزدہ جاں تاں ناک ناز ہے پناہ
تیرا ہی مکر رخ سہی ماسے تیرے آئے کیوں

پرستش طرز دلبری کیجئے کیا کہ بن کھے
اس کے ہر اک اشارے سے نکلتے ہے یہ انا کیوں

غنیہ ناسگفتہ کو دور سے مت دکھا کیوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں سُننے بھرتا کیوں

آجئے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیوں کر ہو

چشمِ خراباں غامضی میں بھی فواہ پرواز ہے
مرمر و نمکوسے کو دود شعلہ آواز ہے

ہو کے عاشق وہ پری دو اور نازک بن گیا
رنگ کھتا جائے ہے جتنا کہ آڑتا جائے ہے

نقش کو اس کے مسعود پر بھی کیا کیا ناز دیں
کیہنتا ہے جس قد آشنا ہی گھنپتا جائے ہے

سادگ پر اس کے مریبانے کی حسرتِ دل میں ہے
بس نہیں چلتا کہ پھر خبر کفِ تاقی میں ہے

نفاذ سے بھی کام کیا وہ نفاذ کا
مستی سے ہر لگم ترے رخ پر بکھر گئی

دیکھو تو دلفریبی اندازِ نقشب پا
موجِ خسراں دار بھی کیا لگن کتر گئی

دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر
مشرستانِ بے ستاری ہے

نہ شعلے ہیں یہ کثر نہ برق میں یہ ادا
کوئی جاؤ کہ وہ شوقِ تند خو کیا ہے

چپک رہا ہے دل پر لہو سے پسراہی
بہلی جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

قرہ بیا بجا ہو جو کچھ ہو
کاش کہ تم میرے لئے ہوتے

مارنی لگی دیکھ روتے یار یاد آیا اسد
جوشِ نعلِ بہاری اشتیاقِ آگیز ہے

مُز نہ دکھلا مے نہ دکھلا، پر یہ اندازِ عتاب
کھول کر پروہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

وہ بیشتر مہی پرول میں جب اُتر جاوے
نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہتے

نہیں نگار کو آفت نہ ہو نگار تو ہے
روانیِ روشنی و شمعِ ادا کہتے !

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طاوتِ چمن و سخنِ ادا کہتے !

چاہے ہے پھر کسی کو مفت بل میں آندو
مرے سے تیز دشتِ مرغان کئے ہوئے

اک نہ بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
پہرِ زرخیز سے لکھستان کئے ہوئے

لنگے ہے پھر کسی کو لب بام پر ہو سس
نرسے سے تیز دشتہ مڑا لگن کئے ہوئے

یہ پری چسورہ لوگ کیسے ہیں
غزوة و عشوة ادا کیا ہے

شکر زلف حنبر میں کیوں ہے
نغمہ چشم سُرور سا کیا ہے

میں طویل انتخاب یہاں کر پیش کیا گیا ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ سن کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرنے کے لئے جو زاویے غائب نے ان اشعار میں تلاش کئے ہیں اس کی پوری طرح وضاحت ہو اور ان سے صحیح طور پر آشنا ہونے کا موقع ملے۔ ان اشعار کی بنیاد صرف مشاہدہ نہیں ہے بلکہ محسوسات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں خارجیہ کا رنگ نظر نہیں آتا۔ برخلاف اس کے داخلیہ کا رنگ ان میں خاصا گہرا نظر آتا ہے۔ یہ حتیٰ سے زیادہ حتیٰ کے رد عمل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ حواس کے ارتعاش کی پیداوار ہیں۔ اس لئے حواس میں ارتعاش پیدا بھی کرتے ہیں۔ ان کی جڑیں احساس اور جذبے کی زمین میں بڑی گہری ہیں۔ اس لئے ان میں سے ہر ایک ایک ہر گز تجربہ معلوم ہوتا ہے۔ ان میں بیانیہ انداز نہیں ہے۔ بلکہ پہلو وار طرزِ اظہار ہے۔ اور اسی پہلو وار طرزِ اظہار میں اس

جمال آفرینی کا راز ہے جو غالب کا طرہ امتیاز ہے۔

ان اشعار کے موضوعات مختلف اور متنوع ہیں۔ لیکن ان کا محور حُسن ہے اور وہ اسی حُسن کے گرد گھومتے ہیں۔ غالب نے ان اشعار میں حُسن کے جن پہلوؤں کا یا جن پہلوؤں کے حُسن کا ذکر کیا ہے وہ بھی نئے ہیں اور جس انداز میں ان کا ذکر کیا ہے ان میں بھی ایک نیا پن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان اشعار میں سے ہر ایک میں جدت اور ان کی خصوصیت کسی نہ کسی زاویے سے اپنا جلوہ ضرور دکھاتی ہے اور ان کے حُسن و جمال کا راز اس جدتِ ادا میں بھی ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی کہ حُسن کے بیان میں بعض مقامات ایسے بھی آتے ہیں جب غالب کا ذوقِ جمال احساسِ مزاج کے ساتھ مل کر ان اشعار میں جبری طور پر ایک نہایت ہی حُسنِ فضا قائم کر دیتا ہے اور یہ فضا غالب کے فن کی جہان ہے۔ اس کے علاوہ غالب کے فکری میلان اور فلسفیانہ رجحان نے حیرت کی جہ فضا ان میں سے بعض اشعار میں پیدا کر دی ہے وہ بھی احساسِ جمال کی تسکین کا باعث بنتی ہے۔ غرض حُسن اور حُسن پرستی کے موضوع نے غالب کے فن میں بڑے پہلو پیدا کئے ہیں اور ہایاتی اعتبار سے اس کو حد درجہ دلآویز اور دل نشین بنا دیا ہے۔

غالب نے حُسن اور حُسن پرستی کے موضوع پر جن اشعار کی تخلیق کی ہے، ان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ حُسن کے بارے میں عمیق سطحی باتوں کی ترجمانی نہیں کرتے۔ بلکہ انسان کی ذہنی اور جذباتی کیفیت اس نئے جہانی تقاضوں، اس کی خواہشوں اور کمزوریوں اور اس کے فکر و شعور کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے یہاں

حسن کا بیان ، انسانی نفسیات اور انسان اور انسانی زندگی کے درمیان باہمی رشتوں اور روابط کا بیان بن جاتا ہے ۔ اس سلسلے میں وہ بعض ایسے معاملات و مسائل کی ترجمانی کرتے ہیں جن میں بہ ذاتِ خود بھی حسن ہوتا ہے لیکن غالب اس سلسلے میں حالات و واقعات کی جو صورتیں پیدا کرتے ہیں ، وہ ان کو کچھ زیادہ ہی حسین بنا دیتی ہیں ۔

یہ صورت سال یوں تو ان کے ایسے اشار میں بھی نمایاں ہے جن کا موضوع حسن اور حسن پرستی ہے لیکن اس کی بہترین مثالیں ان اشار میں نسبتاً زیادہ ملتی ہیں جن میں حسن سے زیادہ عشق و عاشقی کے مختلف اور متنوع پہلوؤں کا بیان ہے ۔ عشق و عاشقی کے بیان میں غالب نے ہر وہی زندگی کو اپنے دائرے میں سمیٹ لیا ہے ۔ یہی سبب ہے کہ ان کی مستقیم شاعری میں جن مضامین کا بیان ملتا ہے ، ان میں بڑا تنوع ہے ۔ وہ کہیں عشق و عاشقی کے جگہ جگہ پہلوؤں کی ترجمانی کرتے ہیں ۔ کہیں غرافت اور مزاح کے پیرائے میں اس جذبے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں ۔ کہیں انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اس جذبے کی ولادت و کیفیات کو پیش کرتے ہیں ۔ کہیں حد درجہ رنگینی اور رعنائی کے ساتھ اس کے مختلف معاملات کی تصویریں بناتے ہیں ۔ کہیں حد درجہ گہرائی کے ساتھ اس کے پیچیدہ مسائل کو سلجھاتے ہیں ۔ کہیں نہایت بے باکی کے ساتھ اس جذبے کے بعض حقائق کو بیان کرتے ہیں اور کہیں بڑی ہر گیری کے ساتھ اس جذبے کی ماہیت کا سراغ لگاتے ہیں اور اس کی نفسیاتی تحلیل کرتے ہیں ۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ان تمام مختلف بلکہ متضاد پہلوؤں کی ترجمانی میں جاپاتی انکار کی نہی نہی

صورتیں پیدا کی ہیں۔

مثلاً کے طور پر عشق و عاشقی کے مروج پر غائب کی شاعری
میں اس قسم کے اشارے بھی ملتے ہیں۔
بئیں کے کاروبار پر ہیں خندہ اسے گل
کہتے ہیں جس کو خلق غل ہے داغ کا

اس سادگی پر کون نرم رہا ہے اسے خندا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں سوار بھی نہیں

آنکھ کی تصویر سزا ہے پیکینی ہے کہ ۳
تجربہ پر کھن جادوے کہ اس کو حسرت دیدار ہے

چھوڑی اسد نہ سم نے گدائی میں دل لگی
ساکس ہوئے تو عاشق اہل کرم ہوئے

کہتے ہو زوں گے دل ہم نے گر پڑا پایا
دل کہاں کہ گم کیجئے ہم نے مہا پایا

غافل بن رہتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہتے

سپاہتے ہیں خوبرویوں کو است
آپ کی صورت تو دیکھ چاہئے

سادہ و پرکار ہیں خوباں غالب
ہم سے بیانِ دانا باندھتے ہیں

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ منت ہاتھ آئے تو مال آجیہے

مگر کھوئے کوئی اس کو خلا تو ہم سے کھواتے
ہوتی سج اور گھرے کان پہنک کر مسلم نکلے

دور پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیا پھر گیا
جتنے عرصے میں مراثیا ہوا بسترِ کھلا

دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں اور ہاؤں دُور سے ترے بن صدا کئے

دے دو جس قدر ذلت ہم ہنسی میں نہیں گئے
بارے آشنا نکلا ان کا پاس بان اپنا

گلاب کے وہ چپ تھا مری جوشامت آئی
آٹا اور آٹھ کے قدم میں نے پاباں کے لئے

میں نے گلاب کو بزمِ ناز چاہئے غیسرے ہتی
نئے کے ستم عزیمت نے مجھ کو آٹا دیا کریں

ہے کیا جو گئی کے بانڈی میری بلاؤں سے
کیا جانتا نہیں ہوں ستاری کمر کو میں

ان اشار میں شوخی کا حسن ہے۔ نظرات کا جہل ہے۔ غالب
اس انداز سے حسن و جمال کو پیدا کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اردو غزل
کی روایت میں صرف شیخ اور واعظ کے ذکر کے ساتھ شوخی اور نظرات
کا حسن و جمال پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور موضوع میں حسن کی
یہ قدر نمایاں نہیں ہوتی۔ لیکن غالب کا کمال یہ ہے کہ حسن و عاشق اور
کار و بارِ شوق کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی میں انہوں نے بعض ایسی صورتیں
پیدا کی ہیں جن کے بیان میں حسن و جمال کا یہ انداز پیدا ہو گیا ہے۔ حسن
کو دماغ کا نخل کہنا، محبوب کا بغیر تلوار کے ڈرنا اور عاشق کا سادگی پر
مرنا، حسرت و یار کو ظاہر کرنے کے لئے آنکھ کی تصویر مرنے پر کھینچنا،
گدائی میں حلّی کو نہ چھوڑنا، دل کا محبوب سے واپس نہ ملنا۔ مرخصوں
کے لئے اچھی صورت کا عاشق ہونا، بیچ کو گھر سے کان پر رکھ کر قلم
نکھنا، یا سب دربان سے ڈرنا، عاشق کا پسپاں کے قدم لینا، محبوب کا

عاشقی کو غیر بکر اٹھا دینا — تمام مضامین آرد و غزل کی روایت میں نئے ہیں۔ اسی لئے غالب نے ان کو پیش کرنے میں بھی ایک نیا انداز بیان اختیار کیا ہے۔ ان مضامین میں شوخی ہے۔ ان کی بنیاد احساس مزاح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب نے ان کے ہایاتی افسار میں خرافت سے کام لیا ہے اور اس طرح وہ فنی اعتبار سے حق کاری کے ایک ایسے انداز کو پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جو صرف انہیں کے فنی کا جہت ہے۔

عشق و عاشقی کے بیان میں تشاہیر رنگ اور طریقہ آہنگ بھی غالب کی شاعری میں بہت نمایاں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عشق کو غالب نے انسان کا ایک بنیادی جذبہ اور دو انسانوں کے درمیان ایک نبیلی رشتہ قرار دیا ہے۔ اس رشتے میں بعض ایسی منزلیں بھی آتی ہیں، جب انسان کی آنکھوں کے سامنے رنگیں پردے سے پڑ جاتے ہیں اور وہ اس زندگی کے ہر پہلو اور کائنات کی ہر چیز کو رنگیں اور پرکارا شگفتہ اور شاداب دیکھتا ہے۔ یہ انسانی زندگی کے حسین ترین لمحے ہوتے ہیں۔ ان لمحوں میں رنگ بکھرتے ہیں اور زندگی رنگینی اور رعنائی سے بھرپور ہو جاتی ہے۔ غالب کی شاعری میں اس کیفیت کی ترجمانی بہت زیادہ ہے۔ اور اس کیفیت کی ترجمانی میں انہوں نے جو انداز بیان اختیار کیا ہے وہ اپنے موضوع کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس انداز بیان میں بھی رنگینی اور رعنائی کا شباب نثر آتا ہے اور شگفتگی اور شادابی اپنے مزاج کمال پر دکھائی دیتی ہے۔

یہ اشعار نہ صرف موضوع بلکہ اسلوب اور انداز بیان کے لحاظ

سے بھی کتنے رنگیں اور کس درجہ مختلف اور شاداب ہیں ۔
 تجاہل پیشگی سے مدعا کی
 کہاں تک اسے سراپا ناز کی کیا

فرازش ہائے جاوید کیت ہوں
 شکایت اسے رنگیں کا گلاب

ننگا ہجے عا با سپاہتا ہوں
 تناظر اسے تکیں آزا کی

سے تو مٹ سوتے ہیں اس کے پاؤں کا پور مگر
 ایسی باتوں سے وہ کافرہ گان ہو جائے گا

ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی
 آخراں شوق کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

ذکر اس پری بخش کا اور پھر بیان اپنا
 بن گیا رقیب آخرت جبراز دان اپنا

سے وہ کیوں بہت پیچھے ہم حیر میں یارب
 آج ہی ہوا غفلت کو امتحان اپنا

چکے چکے بڑکھوتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیانِ شرفی گفتار دوست

تو اور آرائشِ حسنِ کامل
میں اور اندیشہ ہائے دور و دراز

دھمل دھپا اس سراپا ناز کا شیرہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبِ پیشِ دستی ایک دن

ہم سے کھل جاؤ، وقت سے پرستی ایک دن
ورنہ ہم پھیرنے لگے دکھ کو مژدہ متی ایک دن

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں
اک چھیڑ ہے وگرنہ مرادِ امتحان نہیں

کس مژدے سے شکوہ کیجئے اس مصلحتِ خاص کا
پرستش ہے اور پائے سخنِ درمیان نہیں

پور نہیں نہ دیکھتے دُشمنام ہی بھی
ہزموں تو رکھتے ہو تم گرزبان نہیں

ہاں ہے ہاتے بوسہ لے کرں گے ابھی
غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

مشاکر اسے جو آئینہ داری
تجے کس قنارے ہم دیکھتے ہیں !

دشمنِ غمزہ جاں تاں ناکِ ناز بے پناہ
جیرا ہی مگر رخ مہی سامنے تیرے آنے کیوں

غمنہ ہاشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں !
بوسے کو پوچھا ہوں میں مڑے جے بنا کر یوں

پرسش طرزِ وبری کیجئے کیا کہ بن کہے
اُس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کیوں

رات کے وقت سے چتے ساتھ رقیب کو لئے
آنے وہ یاں خدا کرے پر نہ خدا کرے کہ یوں

تیرے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھئے
سامنے اُن بیٹیاں اور یہ دیکھنا کہ یوں

بزم میں اس کے دو برو کیوں نہ سمجھیں بیٹھے
اس کی تو خاموشی میں ہی ہے یہی دُعا کہ یوں

بجے سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح
دیکھ کے میری بے خودی پہننے لگی ہوا کہ یوں

کب بجے کوئے یار میں رہنے کی دُعا یاد تھی
اُتار دے دار بن گئی حیرتِ نقشب پنا کہ یوں

گرتے دہ میں ہو خیالِ محل میں شوقِ کا زول
موجِ مہبطِ آب میں مارے ہے دستِ و پا کیوں

دُعا کیسی کمان کا عشقِ جب سر پھوڑنا ٹھرا
تو پھر اسے لگدول تیرا ہی غلبہ آستان کیوں ہو

یار سے چھیڑ چلی جاے اسد
گر نہیں وصل تو مُسرت ہی سہی

اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے
بیٹھا رہا اگرچہ اُٹھائے ہوا سکئے

سادگی پر اس کی مرنے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چٹا کو پھر غنہ گفتِ قاتل میں ہے

پھر کچھ اک دل کو بیتیاری ہے
سینہ جو یا تے زخم کا ر ی ہے

پھر جگر کھونے لگا ناخن
آہِ فصلِ لار کا ر ی ہے

دل بوائے خواہم ناز سے پھر
عشرستانِ بے قساری ہے

سے نے کیا ہے محن خود آرا کو بے حجاب
اسے شوقِ یں اجازتِ تسکیم و ہوش ہے

کبھی ٹپکی بھی اس کے جی میں گر ابا تے ہے بخت
جہانیں کر کے اپنی یاد شرماتے ہے مجھ سے

وہ بدخوا اور میری داستانِ عشقِ طوفانی
عبادتِ عشقِ قاسم بھی گھبرا جاتے ہے مجھ سے

اودھ وہ بدگمانی ہے اودھ وہ ناتوانی ہے
زبیاں بجاتے ہیں بھڑے زبلاں بجاتے ہیں بھڑے

ابنِ اشعار میں انسان کی لطیف ترین کیفیات کا بیان رنگین ترین پیرائے میں ہوا ہے۔ غالب نے ان میں نوادش ہائے بے جا، شکایت ہائے رنگین، نگاہ بے محابا، تداخل ہائے ممکن، آزما، شوخی، گفتارِ دوست، آرائشِ غمِ کامل، اندیشہ ہائے دور و دراز، تھڑستی، لطفِ خاص، بھائے بوسہ، حیرتِ آئینہ داری، دشتِ غمزہ، نادرِ ناز، فنیہِ تاشگفتہ، پرکششِ طرزِ دہری، سیرتِ نقشب پا، آمدِ فعلِ لالہ کاری، شہرستانِ بیقراری، اجازتِ تسلیم و ہش، حسنِ خود آرا کی بے جہانی کی حسین اور بڑکار ترکیبوں میں کاروبارِ شوق کی جن منزلوں کی تصویریں کھینچی ہیں وہ بلاشبہ بہ ذاتِ خود بھی حسین اور دکھ دینے والی ہیں لیکن غالب کے اشعار و ابلاغ کی رنگینی اور پرکاری نے ان کو کچھ اور بھی رنگیں اور پرکار بنا دیا ہے لیکن ان میں صرف الفاظ اور ترکیبوں کا حسن ہی نہیں ہے جو غالب کے اس قسم کے اشعار کو جالیاتی انداز سے مالا مال کرتا ہے۔ بلکہ مجموعی طور پر جالیاتی انداز کی وہ فضا ہے جو غالب کے ایسے بچے ہوتے مذاق کے شاعر ہی کی شاعری میں پیدا ہو سکتی ہے۔ ان اشعار میں سے بیشتر میں کاروبارِ شوق کے مختلف مساعلات کی ترجمانی ہے لیکن جہاں تک اندازِ لائق ہے کسی ایک شعر میں بھی وہ فضا پیدا نہیں ہوتی جو مسالہ بند شاعروں کی شاعری میں عام طور پر نظر آتی ہے۔ غالب کے مذاق میں اتنی تہذیب اور شائستگی ہے کہ وہ کاروبارِ شوق کے

ان لموں کی ترجمانی میں بھی اپنے حدود سے باہر نہیں نکلتے بلکہ جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہے، وہ ان لمات کی ترجمانی میں کچھ زیادہ ہی لطافت اور نفاست کا اہتمام کرتے ہیں۔ لیکن یہ اہتمام شعوری نہیں ہوتا۔ یہ تو ان کا مزاج ہے چنانچہ اس گمذب اور لطافت پسند مزاج ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ وہ ان سماعت کی ترجمانی میں جمالیاتی انحصار کی لطافت اور نفاست کو باقی رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اس قسم کے اشعار میں یہ جمالیاتی انحصار اپنی انتہائی بلندیوں پر نظر آتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ جمالیاتی انحصار کا یہ انداز غالب کی شاعری اور خاص طور پر ان کے فن کا بہت بڑا سراہ ہے۔ کیونکہ اس سے نہ صرف ان کی شاعری میں بلکہ اردو شاعری کی روایت میں ایک رنگینی اور شادابی نظر آتی ہے اور اس کے اثرات، غالب کے بعد تیسرے شاعروں کے یہاں بھی کسی نہ کسی صورت میں ضرور ملتے ہیں۔ لیکن غالب کا اس سے بھی بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اس رنگین اور چرکار، گفتگو و شاداب جمالیاتی احمقہ کے ساتھ ساتھ جمالیاتی انحصار کا وہ انداز بھی پیدا کیا ہے جس کو دل پر لگی ہوئی چوٹ ہی پیدا کر سکتی ہے۔ اس جمالیاتی انحصار کی بنیاد ایک قسم کا گداز ہے جو احساس عروسی کے اُمتوں پیدا ہوتا ہے۔ اس کی اساس ایک قسم کی کسک ہے جو حسرت، ناکامی، ناامیدی، بے اختیاری اور بھوری کے اُمتوں و جد میں آتی ہے۔ غالب کی شخصیت میں احساس نشاط اور احساس طرب کے ساتھ احساس عروسی و ناکامی بھی ملا ہوا تھا اور اس احساس عروسی و ناکامی نے ان کے یہاں کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کر لی تھی۔ سبب اس کا یہ ہے

کرناب طبیعت اور مزاج کے اعتبار سے رومانی تھے۔ رومانی کے یہاں یہ دونوں احساسات شدید ہوتے ہیں کیونکہ احساس نشاط کی شدت اس کے یہاں احساس فردی کو شدید سے شدید تر کرتی رہتی ہے۔ اسی لئے رومانی مزاج شغف میث و نشاط سے ہی مطمئن نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کے احساس کی شدت اور تخیل کی جلد پروازی اس کو نشاط و طرب کے لمحوں میں بھی یہ احساس دلاتی رہتی ہے کہ یہ لمحے بھی باقی رہنے والے نہیں کیونکہ انسان کا مقصد یہ ہے کہ اس کا قلب ہمیشہ نگار اور اس کی چشم ہمیشہ خون نشان رہے۔

غالب نے ایک رومانی کی حیثیت سے اس حقیقت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ایسا شاعر جو عشق کے رشتے کو صرف خواہش قرار دیتا ہو اور محبوب کی پرستش کو طاقت پر محمول کرنا ہو، جو عاشق بننے کے باوجود اپنی مشوق فریبی کا ڈھنڈورہ پیٹتا ہو، اور جو عشق کو صحن و ماغ کا غلل جانتا ہو^(۱)، وہ جب عشق کی واردات و کیفیات کی ترجمانی کرتا ہے تو اس کے کلام میں ایک گداز اور کسک کی سی

وہ خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار

کیا پوچھا ہوں اس بیت بیدار کو کہ میں

۱۲، عاشق ہوں پر مشوق فریبی ہے مرا کام

بہنوں کو بُرا کہتی ہے بیٹا مرے آگے

۱۳، جیل کے کاروبار پر ہیں غفہ اسے گل

کہتے ہیں جس کو عشق غلل ہے و ماغ کا

کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ گہا زہوں کو تڑپاتا ہے اور یہ کک احساس
 علم کی ایک لہر کو بیدار کرتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کی وجہ سے بیزاری
 کا احساس پیدا نہیں ہوتا۔ غالب نے عشق و عاشقی کے انفعالی پہلوؤں
 کی ترہائی بھی کی ہے۔ داروات و کیفیات کی مصوری میں بھی وہ پیش
 رہے ہیں۔ انہوں نے علم کا بیان بھی کیا ہے لیکن ایسے مواقع پر ان
 کے اظہار و ابلاغ میں انفعالیات کا رنگ نمایاں نہیں ہوتا اور یاسیت کی
 تاریکی بھی اپنے پر نہیں پھیلاتی بلکہ سبب ان کا فن زندگی کی ان منزلوں
 سے گھومتا ہے تو وہ اس کی بنیاد اصیت پر استوار کر کے اس میں ایسا
 آفاقی رنگ بھرتے ہیں کہ اس کی تندیب ہو جاتی ہے اور وہ علم انسان
 اور انسانیت کے لئے گہرا ہو جاتا ہے اور یہ کیفیت اس کے لئے لایت
 اور آسودگی کا باعث بن جاتی ہے۔ غالب کے فن میں سبب یاتی
 اظہار کی وہ آن بان اور شان پیدا ہوتی ہے جو صرف انہی کا حصہ
 ہے۔

یہ اشار اس کی صبح ترہائی کرتے ہیں

عشق سے طبیعت نے زمیت کا مزہ پایا
 درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں
 اگ اس گھر کو گی ایسی کہ جوت نکل گیا

بوسے گل ناز دل درد و چہرہ رخ منل جو تری بزم سے نکلی سو پریشان نکلو

دل تا بگر کہ ساحل دریائے خون ہے اب
 اس رگبذر میں جلوہ گل آگے گردِ دست

میں نے چاہا تھا کہ اندوہ و دنا سے جھوٹوں
 وہ تنگدست مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا ،

کس سے عروسی بہت کی شکایت کیجئے
 ہم نے چاہا تھا کہ مَرجا تیں سودہ بھی نہ ہوا

اب میں بھول اور ماتم یک شہرِ آرزو
 توڑا جو توڑنے آئینہ شمال دار تھا

غمِ ذاق میں تکلیف سیرِ گلِ مت و د
 بے دماغ نہیں خندہ اتنے بے جا کا

میں اور بزمِ ے سے یوں تشرِ کام آؤں
 گر میں نے کی تھی تو بے ساقی کو کیا ہوا تھا

ہوئی مدت کہ غالب کر گیا پر یاد آتا ہے
 وہ ہر اک بہت پر کنا کیوں ہوتا تو کیا ہوتا

تم سے ہے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گھر
اس میں کچھ شائبہ خوبیِ تقدیر بھی صحت

دردِ دل کھول کیونکر جاؤں ان کو دکھلاؤں
انگلیاں فگار اپنی خامِ خوں چکاں اپنا

چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیِ گفتارِ دوست

آئے جے بے کسیِ عشق پر رونا غالب
کس کے گھر جانے کا سیلابِ بلا میرے بس

عاشقِ بسدِ طلب اور متنا ہے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ سبگ ہونے تک

میں اور صد ہزار نوائے سبگِ خواہش
تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کب کہوں

متاثر کر اسے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تناس سے ہم دیکھتے ہیں ا

راہِ مشوق نہ رسوا ہو جائے
ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

وہ اُسی شوق سے آزد وہ ہم چندے تکلف سے
تکلف بے طعن تھا ایک اندازِ جنون وہ بھی

مجھ سے مت کہہ تو میں کتا مت اپنی زندگی
زندگی سے بھی مرا ہی ان دنوں بیزار ہے

ہوئے ہیں پاؤں پہلے ہی نبرو عشق میں زخمی
زبھا لگا جائے ہے مجھ سے زعفرانِ اجائے ہے کچھ سے

ان اشعار میں عمومی طور پر جو پہلو نمایاں ہیں، ان میں اصیت، سادگی اور جدت کے عناصر سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ غالب نے یہاں جو بات بھی کہی ہے، جس کیفیت کا اظہار بھی کیا ہے، اس میں اظہارِ لاکوئی نیا پہلو ضرور نمایاں ہوتا ہے۔ غالب کے ان اشعار میں سنجیدگی ہے ورنہ ہے، گداز ہے، کہیں کہیں ان میں ایک کسک کی سی کیفیت بھی مٹی ہے لیکن ان سب کا اظہار ایک پسو دار انداز میں ہوا ہے اور اسی انداز نے ان کے جاپاتی اظہار میں جانِ ڈال دی ہے۔ غالب اس اعتبار سے بہت بڑے فن کار ہیں۔ معمولی واردات و کیفیات میں پسو پیدا کر کے اس کو زمرنِ اہم بلکہ دل کش بنا دینا ان کے فنی کمال پر دلالت

کرتا ہے ۔

جالیاتی اظہار کی یہ پہلو دار کیفیت غالب کی شاعری کے اس حصے میں کچھ اور بھی زیادہ نمایاں ہوتی ہے جس میں انہوں نے معاشرتی حالات اور حیات و کائنات کے مسائل و مسائل کی ترجمانی کی ہے ۔ اس منزل پر پہنچکر غالب زیادہ تر داری کے ساتھ اظہار کرتے ہیں اور اس اظہار کو زیادہ پہلو دار بناتے ہیں ۔ کیونکہ اسی کا مروج اس بات کا تقاضا کرتا ہے ۔ اپنے زمانے کے معاشرتی اور تہذیبی حالات کی ترجمانی اور حیات و کائنات کے بنیادی مسائل و مسائل کی عکاسی کی بنیاد ان کا فکر و شعور ہے ۔ اسی فکر و شعور کے سہارے انہوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کے اسرار و رموز کھوسے ہیں اور ان کی نفسیانہ تحلیل کر کے آج بھی ہر قلمیوں کو سلجھایا ہے ۔ یہی سبب ہے کہ ان کے فن میں ایسے مواقع پر زیادہ گہرائی کا احساس ہوتا ہے اور زیادہ وسعتیں نظر آتی ہیں ۔ جالیاتی اظہار کی اس منزل میں وہ گہری جنیدگی کو اپنا رہنا بناتے ہیں اور پھر اشاعتوں اور کنایوں کے سہارے آگے بڑھتے ہیں ۔ رمزیت اور ایمائیت کا سہارا لیتے ہیں ۔ لطیف ابہام کا دامن پکڑتے ہیں ۔ ان تمام باتوں سے ان کے فن میں اسلیت اور واقعیت ، گہرائی اور گیرائی ، دست اور سہرہ گہری کی خصوصیات پیدا ہوتی ہیں ۔

غالب کی شاعری کا یہ حقد فن اور جالیاتی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اسی مقام پر پہنچکر وہ جالیاتی اظہار کے نئے سانچے بناتے ہیں اور نئے زاویوں سے اظہار و ابلاغ کے ساتھ ساتھ احساس ہمال کی تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں ۔

میرے اشارہ ان کے فہم کی جان ہیں اور ان کے آنچلے میں ان کا یہ
 فنی رحمان اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ بے نقاب نظر آتا ہے ۔

نقش فریادی ہے کس کی شوقی تحریر کا
 کاغذی ہے پیرہن ہر پیر تصویر کا

خنجر پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
 خن کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا !

دل میں ذوق وصل دیا دیار تک باقی نہیں
 آگ اس گھر کو گل ایسی کہ جو خفا حاصل گیا

دل تا بجز کہ ساحل دریا ئے خوں ہے اب
 اس دگنڈر میں جلوہ گل آگے گرد و غبار

مری قیصر میں مضمحل ہے اک صحت خواہ کی
 بیولا برقی خمی کا ہے خون گرم دھتیاں کا

نظر میں ہے ہماری جادہ راہ فنا غائب
 کو یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشان کا

بہترِ غزن ہے ساقیِ خُدرِ تشنہ کامی بھی
جو تو دیانے لئے ہے تو میں خیا زہ ہوں سالی کا

محرم نہیں ہے تو ہی فرائضے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

تلاش کاوشِ غمِ بھراں ہوا است
سینہ کو سقاہِ یزید گہرا ہے راز کا

نہ تھا کہ تو خدا تھا کہ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈکڑیا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

غافل ہو ہم نازِ خود آرا ہے ورنہ یاں
بے شادِ سبا نہیں طسہ گیاہ کا

عشرتِ قلہ ہے دریا میں فنا ہو مہنا
ورد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو مہنا

بچنے ہے جلوہ گلِ ذوقِ ناشامِ ناب
پشم کو چاہئے ہر دنگ میں وا ہو مہنا

نثارِ باندھ سبتہ صد دانہ توڑ ڈال
دبرِ پچھے ہے راہ کو سہوار دیکھ کر

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردہ ساز
میں ہوں اپنی سہکت کی آواز

یک نظرِ بیش نہیں فرست ہستی منِ حق
گر مٹی بزم ہے اک رقصِ شر ہوئے ملک

موفقِ ہستی ہے عشقِ غامذ ویراں ساز سے
ابھنی بے شمع ہے گر برقِ خرمن میں نہیں

سب کمالِ کچھ لادو گل میں منیاں ہر گیش
خاک میں کیا سوتیں ہوں گی کہ پنہاں ہر گیش

ہے آدمی بسببِ خود اک مشرِ خیال
ہم انجمنِ کجے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو!

خیالِ مرگ کب تکیں دلِ آزرہ کو پنشنے
مرے دامِ قنات میں ہے اک صیدِ زہوں وہ بھی

سے مشرت کی خواہش ساقی سرگودس سے کیا کیجئے
 لئے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگون مدھی

مستی کے مت فریب میں آہائے اسد
 عالم تمام حلقہ دام خیال ہے

خیز تماشگشتن ابرگ مافیت مسلم
 باوجود دل میں خواب گل پریشانی ہے

پنہاں تھا دام سنت قریب آشیان کے
 اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

سختی کشتنِ مشق کی پوچھے ہے کیا خبر
 وہ لوگ رفته رفته سراپا آلم ہوئے

یتری ونا سے کیا ہو تھانی کہ دہر میں
 یترے سوا بھی ہم پر بہت سے قسم ہوئے

کھتے تھے جنوں کی حلاوت خون چکاں
 ہر چند اس میں ہاتھ بھاسے قلم ہوئے

ہوتی ہیں سے توجہ حسنگ کی وارہ پالنے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستہ تھو سستہ نکلے

بہس کا سراز جلو، ہے حیرت کو لے خدا
آئینہ زلف شش جبت انتہار ہے

اسے پر تو خود شید جہاں تابِ اوجر بھی
سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

جوشِ جنوں سے پکھنوتا نہیں اسد
صرا ہمارنی آنکھ میں یک مہفت خاک ہے

ان اشعار کی مصنویت وسیع اور ہر گیر ہے۔ ان میں کہیں انسانی
زندگی کی بے ثباتی کا شکوہ ہے کہیں اس زندگی میں انسان کی عروسی کا بیان
ہے۔ کہیں اس بے ثباتی اور عروسی پر غم کا اظہار ہے کہیں فنا کا ذکر ہے،
کہیں انسان اور خدا کے تعلق کی وضاحت ہے۔ کہیں انسان دوستی کا درس
ہے۔ کہیں انسان کی بندی اور برتری کا خیال ہے۔ غالب نے ان موضوعات
کی رجمانی محض فلسفیانہ انداز میں نہیں کی ہے۔ ان سب کو تجربے میں سمایا
ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے موضوعات نے ان کی شاعری میں شاعرانہ
روپ اختیار کیا ہے۔ ان میں طری بنیدگی کا رنگ مزید نمایاں ہے لیکن
ان گھرے موضوعات کو شریعت کے سانچے میں ڈھال کر پیش کرنے کے لئے

غالب کو اشاروں اور علامتوں کا سہارا لینا پڑا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے جالیاتی انہار میں دھڑکتا ایمائیت اور تہ داری کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اور یہ ان کے فن کی نمایاں ترین خصوصیت ہے۔

غرض غالب کی شاعری کے تنوع و مضمرات نے ان کے فن اور جالیاتی انہار میں بھی تنوع پیدا کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں جالیاتی انہار و ابلاغ بھی مختلف طریقوں سے ہوا ہے۔ اور ان کے فن میں اس انہار کے مختلف روپ ملتے ہیں۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس جالیاتی انہار کو موضوع کے ساتھ مکمل طور پر ہم آہنگ کیا ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان پوری طرح مناسبت پیدا کی ہے اور مناسبت اور ہم آہنگی کا یہ عمل ان کا ایک اہم فن کارنامہ ہے۔

روز و آهنگ

شاعری اور شاعرانہ فن کاری کی بنیاد درحقیقت وزن و آہنگ ہے اس کے بغیر شاعری اور اس کے فن کا کوئی تصور نہیں کیا جاسکتا۔ شاعری کے تمام عناصر اسی طور کے گرد گھومتے ہیں۔ وزن و آہنگ ان سب کو اس طرح ایک دھتے میں شلک کرتا ہے کہ ان میں مجموعی طور پر ایک مناسبت اور ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے اور اس طرح وہ شاعرانہ فن کاری کا سب سے اہم عنصر بن جاتا ہے۔ اس کی حیثیت تخلیقی ہوتی ہے اور وہ شاعر کے تخلیقی مزاج کو پوری طرح ظاہر کرتا ہے۔ دراصل وہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں شاعر کی تخلیق رو کا عکس صاف دکھائی دیتا ہے۔ اس کو خیال اور موضوع کا رقص و غریب کہا جاتے تو بے جا نہیں۔ شاعری کا موضوع اور خیال ایک متحرک چیز ہے۔ حرکت ہی کی وجہ سے اس کا وجود ہوتا ہے اور وہ اسی حرکت کے سہارے ایک صورت اختیار

کرتا ہے۔ یہ حرکت ہی درحقیقت وہ وزن و آہنگ ہے جو مُراد اور موضوع کی صحت اور بنیّت کو وجود میں لاتا ہے اور مجموعی طور پر مثنوی تجربے کے عنصر آہنگ کی پوری طرح عکاسی کرتا ہے۔

غالب کی شاعری میں بھی وزن و آہنگ کی یہی صورت ہے وہ ان کے تجربات کا پابند ہے اور ان کے عنصر جذبات و احساسات اور فکر و شعور کے ساتھ پوری طرح تناسب رکھتا ہے اور اس میں ان کے فکر و شعور کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں یکسانی اور یک رنگی نہیں ہے۔ پر ملاط اس کے جو رنگا رنگی ان کے شاعرانہ تجربات میں ہے وہی ان کی شاعری کے وزن و آہنگ میں بھی دکھائی دیتی ہے۔

اس سے قبل اس حقیقت کی وضاحت تفصیل سے کی جا چکی ہے کہ غالب زندگی اور حرکت کے شاعر ہیں۔ ان کے یہاں انفعالیّت ہندی نہیں ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی بیشتر غزلوں میں ایسا وزن و آہنگ ملتا ہے جو انفعالیّت سے زیادہ فعالیت کا ترجمان ہے بلکہ یہ کم از کم یہ سمجھا ہے کہ مجموعی طور پر ان کی غزلوں کے آہنگ میں ایک بلند آہنگی نظر آتی ہے۔ ان کا آہنگ رواں دواں ہے۔ اس کی کیفیت میدانوں میں بے بسے وائے دریا کی لہروں کی سی نہیں ہے بلکہ سمندر میں پیدا ہونے والے مد و جزر کی سی ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ غالب بنیادی طور پر رومانی ہیں اور ایک رومانی کی حیثیت سے ان کی طبیعت میں ایک تیزی اور تندہی ہے چنانچہ یہی تیزی اور تندہی ان کی شاعری کے آہنگ میں بھی متی ہے۔ اس سلسلے

میں سب سے پہلے ان کی شاعری کو دیکھنے اور سننے والے کی تلو بھریوں کے انتخاب پر پڑتی ہے۔ غالب نے اپنے فنی انداز کے لئے بیشتر دماغی دواں بھریوں کا استعمال کیا ہے۔ ان کے یہاں بہت طویل بھریں نہیں ہیں۔ بہت چھوٹی بھریں بھی انہوں نے استعمال نہیں کی ہیں صرف کسی خاص موڈ کو پیش کرنے کے لئے انہوں نے بس چھوٹی بھریوں سے کام لیا ہے۔ لیکن ان چھوٹی بھریوں کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ بیشتر بھری جو ان کی شاعری میں استعمال ہوئی ہیں، وہ ایسی ہیں جن میں تیز اور تند خیالات آسانی سے سمجھ سکتے ہیں، جن میں حقیقت کی پرداز کو بھی اسیر کیا جاسکتا ہے، جن میں نشاط و طرب کے مسالعات بھی جنوبی ادا ہو سکتے ہیں اور جن میں غم و دل، غم روزگار اور غم حیات کی واردات کو بھی اچھی طرح ظاہر کیا جاسکتا ہے۔

بھریوں کے انتخاب اور استعمال میں شاعر کی مخصوص ذہنی کیفیت اپنے آپ کو پوری طرح نمایاں کرتی ہے۔ غالب ایک ایسی شخصیت کے شاعر ہیں کہ چاہے وہ کسی قسم کے جذبات کی ترجمانی کریں، ان کی اس ذہنی کیفیت کا عکس ان میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ مثلاً وہ کسی عالم میں بھی چھینے اور ذمہ رہنے کی آرزو کو خیر باد نہیں کہہ سکتے۔ انتہائی ناسازگار حالات میں بھی اس خواہش اور آرزو کا چراغ ان کے یہاں فروزاں رہتا ہے۔ ناسازگار حالات بھی ان کے خیال میں زندگی کا حقیقت ہیں۔ اس لئے وہ ان کو برداشت کر سکتے ہیں۔ ان کو سازگار بنانے کے لئے بعض صورتیں نکال سکتے ہیں۔ اگر یہ صورتیں نہ پیدا ہوں تو وہ کبھی اس کو زندگی کا قانونی تصور کر کے کبھی انسانی کو ان کے سامنے مجبور اور معذور خیال کر کے اپنے آپ کو

ملتی کر لیتے ہیں۔ اور بعض دوسرے راستوں پہ چل پڑتے ہیں اور کسی نئے افق پر پرواز کرنے لگتے ہیں۔

غالب نے بھی ہمدردوں کو زیادہ استعمال کیا ہے، ان کے پس منظر میں یہی صورت حال نظر آتی ہے۔ مثلاً ان کے یہاں جو مخصوص برجی مبہم مخصوص خیالات اور جذبات و احساسات کی ترجمانی کے لئے زیادہ استعمال ہوئی ہیں، ان کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے ہو سکتا ہے

نقشِ فریادی ہے کس کی شوقیِ عزیر کا
لافتی ہے پیراں ہر ہیکلِ تصور کا

خسے سے طبیعت نے زمیت کا مزہ پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

میں ہوں اور افسردگی کی آمد و غالب کو دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُشیاں جل گیا

دل میں پھر گریہ نے اک شرر چمایا غالب
آہ جو تلوہ ڈنکلا تھا سوطوں میں ٹکلا

دھکی میں مر گیا جو زبابِ نبردِ صفت
عشقِ نبردِ ہمیشہ طلبِ گارِ مردِ صفت

دوسرے میں نقش و خاں برستلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندہ معنی نہ ہوا

ساکش گر ہے زابد اس قدر میں باغِ رضاں کا
وہ اک گلہ مست ہے ہم بنو دوں کے طاقِ نیاں کا

دیکھاؤں گا تشاویٰ اگر فرصتِ زمانے نے
مرا پرداغِ دل اک تخم ہے سر و چراغاں کا

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے وفا ہے
کہ سوج بوسے گل سے ناک میں آنا ہے دم میرا

مرا پا رہی عشق و ناگزیر الفتِ ہستی
عبادتِ برق کی کرتا ہوں اور انسِ حاصل کا

عوم نہیں ہے تو ہی نواہتے راز کا
یاں دھڑ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

شب سہتی پھر انجمِ رخشنہ کا منظر کھلا
اسی تلکٹ سے کہ گویا بت کہے کا در کھلا

شب کہ برق سوزِ دل سے زہرۂ ابراب تھا
شعلہ جو آگِ ہر اک کھلتے گرداب تھا

میں کہ دشوار ہے ہر کام کا آسان ہونا
کدی کو بھی میسر نہیں انس ہونا

دوستِ علمِ خدای میں میری سہی فزائیں گے کیا
دُشمن کے بھرنے تک ناخنیِ بزمِ آئیں گے کیا

میں اور بزم سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی قربِ ساقی کو کب ہوا تھا

عربیِ نسیبِ عشق کے متا بل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا !

ذکر اس پری و شش کا پہلا ہسیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازِ دواں اپنا

غافل بہ وہم تاز خود آرا ہے ورنہ یاں
بے شادِ صبا نہیں طرہ نگاہ کا

ختم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو پیش از یک نفس
 بقیہ سے کرتے ہیں روشنی شمع ماتم حنا ہم

ہم سے کھل جاؤ، وقت ہے پرستی ایک دن
 ورنہ ہم چتریں لگے رکھ کر مذرِ رستی ایک دن

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
 خاک ایسی زندگی پر کہ پتھر نہیں ہوں میں

سب کہاں کچھ لالہ لگیں ہیں غایاں ہو گئیں
 خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پناہ ہو گئیں

دیوانگی سے روش پر زناں بھی نہیں
 یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

کسی کو دے کے دل کوئی قوا سنجہ فغاں کیوں ہو
 نہ ہو جیبِ دل ہی پہلو میں تو پھر مریں زبان کیوں ہو

ہے بزمِ بیاں میں سننے آزادہ ہوں سے
 تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامدِ طبعوں سے

ہری ہستی فضا کے حیرت آباد منت ہے
چھ کتے ہیں نار وہ اسی عالم کا عتقا ہے

دیکھنا قسمت کو آپ اپنے پر شکم آجائے ہے
میں آکے دیکھوں بھوک بھوسے دیکھا جائے ہے

غالب کی پسندیدہ بحرِ یہی یہی ہیں جن میں مندرجہ بالا اشعار کی تخلیق کی گئی ہے۔ ان بحرِوں کا آہنگ دواں دواں ہے۔ ان میں پیری اہل تندی ہے۔ ان میں ایک رکھ رکھاؤ ہے۔ ایک نئے ویسے رہنے والی کیفیت ہے۔ غالب نے ان بحرِوں میں اپنے خیالت کا ہونٹا کر بھی اشعار کی تخلیق کی ہے ان کے تجربے کا آہنگ ان بحرِوں کے آہنگ سے پوری طرح مناسبت رکھتا ہے۔ غالب کے تجربے کی گہرائی نے ان بحرِوں کو زیادہ مستقیم بنا دیا ہے۔ تجربے کی نسبت سے ان بحرِوں میں الفاظ کی محسوس دہرہ بست نے ان کے اندر زیادہ فنگل اور موسیقیت کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اپنی ان پسندیدہ بحرِوں میں غالب نے مختلف ذمیت کے تجربات کو سمو دیا ہے لیکن ان کے موڈ کی ہم آہنگی اور وحدت کو نہیں نہیں گنتی مادہ وہ موڈ زندہ رہنے، دوسروں کو زندہ رکھنے، زندگی کی مسرتوں سے سینہ بھر لینے اور ان مسرتوں کو عام کرنے کا موڈ ہے۔ غالب کی ان پسندیدہ بحرِوں کا آہنگ اسی موڈ کا آہنگ ہے جو ان کے خی میں ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔

اسی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غالب کے یہاں اس موڈ کے علاوہ کوئی

اور سوڈا طاری ہی نہیں ہوتے۔ ایسا نہیں ہے۔ ان کے یہاں شاعری میں ایسے سوڈا بھی ملتے ہیں جن میں حزن و یاس کا آہنگ غالب معلوم ہوتا ہے۔ غالب کے ایسے دہائی مزاج شاعر کے یہاں اس سوڈا کا پیدا ہونا ایسا کچھ عجیب نہیں۔ جیسا کہ اس سے قبل بھی کہا جا چکا ہے ایک دہائی شاعر کو اس قسم کے سوڈا کا سامنا ضرور کرنا پڑتا ہے۔ غالب پر بھی ایسے سوڈا طاری ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس سوڈا کی ترجمانی اور عکاسی کرنے کے لئے انہوں نے چھوٹی بھری استعمال کی ہیں۔ ان کے دیوانوں میں ان چھوٹی بھریوں کی تعداد دوسری بھریوں کے مقابلے میں نسبتاً بہت کم ہے۔ لیکن جتنی غزلیں بھی چھوٹی بھریوں میں ہیں وہ آہنگ اور وزن کے اعتبار سے نہایت مؤثر ہیں۔ ان کا آہنگ تو دونوں میں نشر بن کر اتر جاتا ہے بلکہ ایک ایسے تیرنیم کش کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے جو دل میں اترتا تو بے لکھن جگر کے پار نہیں ہوتا۔

غالبہ کی چھوٹی بھریوں کے یہ اشار ان کے تجربے کی اسی کیفیت کو

ظاہر کرتے ہیں۔

موس کو بے نشاط کار کیا	نہ جو مرنے تو بجینے کا مزہ کیا
تہا ہل پیشگی سے مدح کیا	کہاں ہمک اے سراپا ناز کیا گینا
نور دشن اتے بے جا دکھیتا ہوں	شکایت اے رنگیں کا گلا کیا
کیا کس نے سبکو دلی کا دھوئی	ٹھیکب خاطر عاشق سبدا کیا

جانتے جان ہے غالب اس کی ہر بات
مبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

قدو بہشت کشی دُرا نہ ہوا میں نہ اچا ہوا نہ ہوا
 ہم کہاں بہشت اُزما نے جا میں تو ہی جب خیر اُزما نہ ہوا
 ہے خیر گرم اُن کے آنے کی آج ہی گھر میں پوریا نہ ہوا
 زخم گروب کیا ہو نہ مست کام گر مگر گیا روا نہ ہوا
 کچھ تو پڑیے کر لوگ کہتے ہیں
 آج غالب غزل سرا نہ ہوا

پھر مجھے دیدہ تر یاد آیا دل حیرتِ تشہ فریاد آیا
 دم یا تھا نہ قیامت نے ہنوز پھر ترا دقت سفر یاد آیا
 زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی کہیں ترارا گھڑ یاد آیا
 پھر ترے کرپے کو جاتا ہے خیال دل لگم گشتہ مگر یاد آیا
 کوئی دیرانی سی دیرانی ہے دشت کو دیکھ کے گمراہ یاد آیا
 میں نے جنوں پہ لڑکھن میں اسد
 حلق اُٹایا تھا کرسر یاد آیا

نہ لگی فتنہ ہوں نہ پردہ ساز میں ہوں اپنی شکست کی آواز
 تو اورد اراشیں خشمِ لاکل میں اورد اندیشہ ہائے دیدہ وراز
 ہوں گرفتارِ اُفتابِ سیاہ ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز
 جہ کو پر چھا تو کچھ غضب نہ ہوا میں غریب اور تو غریب فراز
 اسد اللہ خان متاسم ہوا
 اسے ورینا وہ رند شاہ باز

وہ فراق اور وہ دھماکا کھان
وہ شب و روز و ماہ و سال کھان
فرست کار و بارِ شوق کہے
ذوقِ نفاہ و ہوا کھان
تھی وہ اک شخص کے قصہ سے
اب وہ زمانہ خیال کھان
ایسا آسان نہیں ہو دونا
دل میں غارت جگر میں سال کھان
معمول ہو گئے توئی حنا کبے
وہ عناصر میں امتداد کھان

جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں
بنا کر فیروں کا ہم بھییں غاب
تماشا ہے اہل کرم دیکھتے ہیں

راہِ مستحق نہ رسوا ہو جاتے
ورنہ مرنے میں کچھ بچید نہیں
گدشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے
غمِ حسد ہی جاوید نہیں
کھتے ہیں جیتے ہیں امید پر لوگ
ہم کو بچنے کی بھی اُمید نہیں

اے لاکھوں نے اثر دیکھا ہے
ہم بھی اک اپنی ہوا باز مچتے ہیں
اہلِ تدبیر کی دامِ اندگیاں
آجوں پر بھی حنا باز مچتے ہیں
سادہ چڑکار ہیں خراباں خالہ
آجوں پر بھی حنا باز مچتے ہیں

عشق بھر کو نہیں دخت ہی ہے میری دخت تری شہرت ہی ہے
 ہم بھی تسلیم کی خوشدلیں گے بے نیازی تری عادت ہی ہے
 ہر سے چھیڑ پھیل جائے اسد
 مگر نہیں وصل تو سرت ہی ہے

کوئی دن گر زندگانی اور ہے اپنے ہی میں ہم نے ٹھانی اور ہے
 ہر چٹکی غالب بلائیں سب تمام
 ایک رگ ناگانی اور ہے

کوئی آسید بر نہیں آتی کوئی صدمت تو نہیں آتی
 آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی
 مرنے ہیں آرزو میں مرنے کی موت آتی ہے پر نہیں آتی
 کہے کس مرنے سے جاؤ گے غالب
 حرم تم کو مگر نہیں آتی !

دلِ نادان تجھے بھرا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے
 ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار یا الہی یہ مایوس کیا ہے
 میں بھی مرنے میں زبان رکھا ہوں کاش پوچھو کہ عاکیا ہے
 پھر کچھ اک دل کو بھرتی ہے سینہ جو یاسے زخم لگای ہے
 پھر بھر کھودنے لگا ناخن آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے
 وہی صد رنگ تارِ فرسائی وہی صد گونہ اشکیا ہے

بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

غریبِ عقل میں بوسے جام کے ہم رہیں یوں تشنابِ پیہم کے
خستگیِ کام سے کیا شکوہ کر یہ تھکنڈے ہیں چربخِ نیلِ کام کے
عشق نے غالبِ مکت کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے!

کب وہ سُنا ہے کہانی میری اور پھر وہ بھی زبانی میری
غلشِ غمزہٴ خونِ ریز نہ پڑ پڑے دیکھ خونِ نابِ نشانی میری
کیا بیان کر کے مرادیں گے یار مگر اُسُشتِ بیانی میری
کو دیا صنعت نے عاجزِ غالب
ننگِ ہیری ہے جوانی میری

غالب کے متداول ویران میں چھوٹی بھڑوں کی یہ غزلیں پندرہ
ہیں سے زیادہ نہیں ہیں۔ لیکن جیسا کہ ان غزلوں کے مستندِ جہ بالا
انتخاب سے ظاہر ہے ان کا مخصوص وزن و آہنگ غالب کی اس
مخصوص ذہنی کیفیت کی عکاسی اور اس خاص سرٹ کی ترجمانی کرتا ہے
جس سے وہ اس وقت گزرے ہیں جب ان اشعار کی تخلیق کا سلسلہ
جاری تھا۔ ان میں سے بیشتر اشعار کے آہنگ میں آہستہ روی اور
دھماہا ہے اس لئے کہ غالب نے جن تجربات کو اس وزن و آہنگ

کے سامنے ہیں وصال ہے اس میں کسی نہ کسی حد تک ایک حزنہ کیفیت ضرور ہے۔ اس حزنہ کیفیت کا جنہ کہیں احساس عروسی ہے، کہیں ماضی کا ماتم، کہیں نشاط و طرب سے علیحدگی، کہیں انسانیت کا غم، کہیں وہ آہنگ جو اس حزنہ کیفیت کا ترجمان ہے اس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دلوں میں آکر جاتا ہے۔ جو اس کے تاروں کو چھیرتا ہے اور اس طرح احساسِ حال کی تکیں کا باعث بنتا ہے۔

اس آہنگ میں جو غالب کے یہاں پیدا ہوتا ہے وہ موسیقیت اور نمٹگی ہے جو خود انسانی زندگی کے نشیب و فراز اور اس سے پیدا ہونے والے آہنگ میں پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں اس آہنگ کی جھلک نظر آتی ہے جس کو درڈ سورتھو نے (STILL SAD MUSIC OF HUMANITY) کہا ہے۔ اس آہنگ کے ساتھ انسان (موسس ہے کیونکہ وہ ہر حال اس کے ساتھ میں زندگی بسر کرتا ہے۔ غالب نے اس آہنگ کی تخلیق میں گہرے انسانی شعور کا انداز لگایا ہے۔

غالب الفاظ کے عنصر میں دروبست سے بھی اپنے وزن و آہنگ میں ایک ایسی موسیقیت اور نمٹگی پیدا کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں جو ان کی شاعری کے آہنگ میں جان ڈال دیتا ہے۔ غالب کے شاعرانہ تجربے میں جو باتوں کی اندر نظم وضبط ہے، اس کی جھلک الفاظ کے اس استعمال میں بھی نظر آتی ہے جو ایک عنصر دروبست کی وجہ سے ان کی شاعری کے آہنگ کو موسیقیت اور نمٹگی سے بھنکار کرتے ہیں۔ یوں تو غالب کی شاعری کے آہنگ میں یہ موسیقیت اور نمٹگی بہ بھر پور ہے لیکن مزید

ذیل چند اشار اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

دل گذر گاہ خیال سے و ساقی ہی سہی
گر نفس جادۂ سر منزل تغریٰ نہ ہوا

غوشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گودِ غریباں کا

نہیں معلوم کس کس کا لہر پانی ہوا ہو گا
قیامت ہے سرنگ آورد ہذا تیری مژگان کا

میں ہیں کہ جوشِ باد سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشہ بسا ہے سر شیشہ باز کا

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دست کا کھانوں فریب
آستین میں دشتِ نہاں اٹھ میں خبر کھلا

نوازش اے بے حجب دیکھتا ہوں
شکایت اے رنگیں کا گلا کب

اسد ہم وہ جنوں جہاں گرائے بے سرو پا ہیں
 کہ ہے سر پہنہ مرزا گن آہر پشت غار اپنا

تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا لہر
 اس میں کچھ شائبہ غریب تقدیر بھی صفا

فاضل بہ وہم ناز خود آرا ہے درندہ پاں
 بے شائبہ صبا نہیں طرہ گیارہ کا

تو اور آرائش حسں کا کل
 میں اور اندیشہ آئے دور و دراز

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش ازیک نفس
 برق سے کرتے ہیں بدشمنی شمع نام حنا ہم

منہ صبت کا رو بار شرق کے
 فوق نفارۃ جمال کہاں

یاد نہیں ہم کو بھی شکار لگ بزم آرایاں
 لیکن اب نقش و نگار حق نہیں ہو گیتیں

پرسش طرزِ دہری کیجئے کیا کر رہا ہے
اُس کے ہر اک اشامے سے مجھے ہے یہ اناکریوں

مئے عشرت کی خواہش ساقیِ مگردوں سے کیا کیجئے
لئے منیا ہے اک دو چار جامِ داذگون وہ بھی

کس طرح کاٹے کوئی شبِ ہائے تارِ پرتکال
ہے نذرِ کردۂ اخترِ شکاریائے ہائے

چشمِ خوبانِ خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
مزمورِ تو کوئے کو دو سسلا آواز ہے

گرچہ ہے طرزِ تمنا فل پر وہ دابرِ داذ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے رہیں کہ وہ پا جائے ہے

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی
فقرۂ شررِ قیامت کس کی آبِ دل میں ہے

(۱) اشعار میں گندہ گامِ خیال سے دماغِ جلاوۂ سرِ منزلیِ تقویٰ
مخوشی میں منانِ خونِ گشتہ لاکھوں آرزوئیں، سرِ شکِ آلودہ ہونا جیسی
مترکمان کا جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے۔ آئین میں دشتِ پنهانِ ناتھ

میں خیر کھلا ، نوازش آئے ہے جا ، شکایت آئے رنگیں ، سر پہ تہ مژگان
 آہو ، شائبہ مطلق تقدیر ، بے شانہ سبا ، آرائش غم کا کل ، اندیشہ آئے
 دودھ و دھواں ، برق سے کرتے ہیں روشنی شمع ماتم نماز ہم ، فرصت کا دوبارہ
 شرق ، ذوق نظارہ ہمال ، رنگ و رنگ بزم آرائیاں ، نقش و نگار طاق نیاں ،
 پرکشش طرز و لہری ، سے عشرت کی خواہش ، دودھ پار جام و ڈاگن ، شب
 آئے تار برشمال ، غرورہ اختر شماری ، چشم غرباں خامشی میں بھی ، دودھ
 شعلہ آواز ، پردہ دار ساز عشق ، جلوہ زار آتش ووزخ ، فتنہ شریعت
 و غیرہ کی بے شمار ترکیبوں ، فقروں اور مہلوں میں جو فنگلی اور موسیقیت
 ہے وہ بڑی ہی دلنشین اور دل آویز ہے ۔ اور ان کی اس دل نشینی اور
 دل آویزی کو اندازہ دانی پڑھنے والے اور سننے والے کے حواس ہی
 کرکے ہیں ۔ غالب کا کلام اس قسم کی فنگلی اور موسیقیت سے بھرا پڑا ہے ۔
 یہ ہر ذات خود بھی اہم ہے ۔ لیکن مجموعی طور پر یہ فنگلی اور موسیقیت ان کی
 شاعری کے مجموعی آہنگ پر بھی اثر انداز ہوتی ہے اور اس کو زیادہ مؤثر
 بنا کر جمالیاتی اعتبار سے زیادہ دلنشین و دل فریب بناتی ہے ۔

اس اعتبار سے غالب بڑے چابک دست فن کار ہیں ۔ وہ صرف
 ترکیبوں ، فقروں اور مہلوں کی تراش و تراش ہی سے اپنی شاعری کے آہنگ
 کو مؤثر نہیں بناتے ۔ لیکن خاص کیفیات کی وضاحت کے لئے ایسی مترنم
 زمین کا انتخاب کرتے ہیں جو الفاظ اور ان کی ترکیبوں کی مخصوص درودست
 سے کچھ زیادہ ہی مترنم ہو جاتی ہیں اور ان کی شاعری کا مجموعی آہنگ
 ان کے استعاروں زیادہ جان دار اور مؤثر ہو جاتا ہے ۔ دیکھئے کہ کبھی کبھی
 دل کش زمینوں میں غالب نے بلع آزمائی کی ہے اور الفاظ کے مخصوص

استعمال، ترکیبوں کی مخصوص تراش خراش اور نغزوں کے مخصوص دیوبت سے اسنوں نے مندرجہ ذیل غزلوں میں ترتیب، موسیقیت اور نغمگی کی ایسی کیفیت کو ابھار دیا ہے جو ایک رقص و لغزیب کے منظر لطیف کو آنکھوں کے سامنے لاکر کھڑا کر دیتی ہے۔ یہ غزلیں کیا ہیں خود شاعری اور اس کے فن کا ایک رقص و لغزیب، ہیں۔

کھتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا
دل کہاں کر گم کیجئے، ہسم نے دیا پایا
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا
دد دل دوا پائی دد مر ہے دوا پایا
دوست دار دشمن ہے اتنا دل معلوم
آہ بے اثر دیکھیں نالہ تار سا پایا
سادگی و پیکاری ہے خودی و سبب ساری
حق کو تقاضا میں جزا ت آزما پایا
غنیہ چسپاں کھلنے آج ہم نے اپنا دل
خون کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا
حال دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یقینی
ہم نے بار بار دھونڈا، تم نے بار بار پایا
شعبہ پندر تاسع نے رخصت پر نک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

فکرا اس پر سی دش کا اور پھر بیاں اپنا
 بی گیار قیبت آخرت جو راز داں اپنا
 شتراک بندی پر اور ہسم بنا سکے
 عوش سے ادھر ہوتا کاش کہ مکان اپنا
 دے وہ میں قدر وقت ہم نہی میں نہیں گے
 بدرے آشتا نکلا ان کا پستان اپنا
 سدو دل گھوں کب تک جاؤں ان کو دکھائوں
 آنکلیاں فگار اپنی خارم خون چکاں اپنا
 تاکرے زخمی کر لیا ہے دشمن کو
 دوست کی شکایت میں ہم نے ہم زبان پائی
 ہم کہاں کے دانا تھے کسی ہنرمیں کیا تھے
 بے سبب ہوا غائب دشمن آسمان اپنا

دل ہی تو ہے زسنگ دشت درو سے بھر دئے کیوں
 روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں !
 دیر نہیں ، سرم نہیں ، در نہیں آستان نہیں
 بیٹھے ہیں وہ گڈو پہ ہم کوئی ہمیں آٹھائے کیوں
 جب وہ جہاں دل فرد مسرست مہر نیم روز
 آپ ہی ہو فگار ، سوز پرے میں منہ چھپائے کیوں
 دشت غمزہ جان بستان تاوک تاز بے پناہ
 تیرا ہی کبھی رخ بھی سامنے تیرے آئے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غمِ اصل میں دونوں ایک ہیں
 موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
 حق اور اس پر حق غم رہ گئی بڑا دوس کی شرم
 اپنے پر اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں
 وہاں وہ غمزدار عز و تازیان یہ سحابِ پاسِ دُش
 داء میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں
 ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے دُش بھی
 جس کو سہو دین و دل عزیز اس کی لگی میں جائے کیوں
 غائبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
 وہ بے ناز زار کیوں، کیجئے آئے آئے کیوں

غنیمتِ ناممکنہ کو دُش سے مُت دکھا کر یوں
 بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے تجھے بتا کر یوں
 پرسشِ طرزِ دلبری کیجئے کیا کہ بنی کہے
 اُس کے ہر اک اشارے سے تجھے ہے یادِ اک یوں
 رات کے وقت سے پہنچے ساتھ رقیب کو سنے
 آئے وہ یاں خدا کرے پُر نہ خدا کرے کو یوں
 میرے رات کیا بنی یہ جو کہا کہ دیکھئے
 سامنے آن بیٹھا اور دیکھتے کو یوں
 بزم میں اس کے روبرو کیوں نہ خوش بیٹھے
 اُس کی تو خاموشی میں بھی ہے یہی مدعا کو یوں

میں نے کہا کہ ہر نام چاہیے جیسے ہستی
 سسکی کے ستم عزیمت نے لہجہ کو اٹھا دیا کہ یوں
 لہجہ کو کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح
 دیکھ کے میری بے خودی پہنے گی ہوا کہ یوں
 کب بے کوسے یار میں رہنے کی دمنغ یاد تھی
 آئینہ دار بن گئی سیرتِ نقشب پا کہ یوں!
 گردِ ہترے دل میں سہ خیال وصل میں شوق کا زوال
 موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں
 جو یہ کہے کہ ریزہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی
 گشتِ غالب ایک بار پڑے کہ بے سنا کہ یوں

کارِ گاہِ ہستی میں لالہ داغِ سمان ہے
 برقِ خرمینِ دستِ خوریِ گرم و بہان ہے
 فنیہِ تاشگفتن! برگِ عافیتِ معلوم
 باوجودِ ولعیِ خواب گلِ پریشان ہے
 ہم سے رنج بے تابی کس طرح اٹھایا جاتے
 داغِ پشتِ دستِ عجزِ شلوخسِ بزدان ہے

میں پانچ فرمیں غالب کے متبادل ویران میں ایسی ہیں جی کو پڑھ کر خود
 پڑھنے والے کا احساسِ جاںِ رقص کرتا ہے کیونکہ جن زمینوں میں یہ کہی گئی ہیں،
 ان میں ہر ذاتِ خود بھی ایک رقص کا سا عالم نظر آتا ہے۔ پھر ان میں شاعر

کے خیالات رقص کرتے ہیں، اُنہی کے احساسات رقص کرتے ہیں۔ انسانا
 رقص کرتے ہیں، ترکیبی رقص کرتی ہیں، شاعری رقص کرتی ہے، اظہار و
 ابلاغ رقص کرتا ہے، غرض ان میں رقص ہی رقص ہے۔ اُن اُن گنت عناصر
 کا رقص جس کے مجموعی استراج سے فن اور جالیاتی اظہار کی تشکیل ہوتی ہے۔
 اور رقص کے اس آہنگ کو غائب کی اس ذہنی اور جذباتی کیفیت
 نے تخلیق کیا ہے جو ان کے فن اور جالیاتی اظہار کا بیج اور عروج ہے۔
 غائب، جیسا کہ پہلے بھی واضح کیا گیا ہے۔ خیال اور جالیاتی اظہار،
 مواد اور فن کی ہم آہنگی کے فن کار ہیں۔ غزموں کے لئے حلق زمینوں کا
 انتخاب بھی انہوں نے اسی ہم آہنگی کے شعور کے زیر اثر کیا ہے۔
 چنانچہ اسی ہم آہنگی کے شعور کا یہ نتیجہ ہے کہ انہوں نے آہنگ کی
 مخصوص کیفیت کی ترجمانی کے لئے بعض ایسی زمینوں کو استعمال کرنے کا
 تجربہ کیا ہے جو اردو شاعری کی روایت میں بہت عام نہیں ہیں۔ یہی
 غائب نے تجربے کے خاص آہنگ کی ترجمانی کے لئے ان زمینوں کو استعمال
 کیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان کی تخلیق کی ہے۔ یہ زمینیں عام
 طور پر مروج نہیں ہیں۔ لیکن غائب نے ان کو کسی خاص کیفیت کو ظاہر
 کرنے کے لئے رواج دیا۔ ان زمینوں کا وزن و آہنگ دیکھئے۔

تم اپنے شکوت کی باتیں زکمر و کھو کر پوچھو
 حذر کرو میرے دل سے کہ سب سے آگاہی ہے
 وہاں وہ دلا بھی تو منتقم ہے کہ آئندہ
 زلزلہ سحری ہے نہ آؤ نیم شبی ہے

جب فساد سے جلا کے چلے ہیں ہم آگے
 کو اپنے ساتھ سہراؤں سے ہے دو قدم آگے
 فتنائے سماجے ہاں اُخرابِ بادۂ اُغت
 فقط خواب کھابیں زہلِ سکا قلم آگے
 غمِ ناز نے جھاڑی فسادِ عشق کی مستی!
 دگر ہم بھی اُٹھاتے تھے فتنۂِ الم آگے
 نھا کے واسطے داد اس جنوںِ شوق کو دینا
 کہ اس کے در پہ پہنچے ہیں نادر سے ہم آگے
 یہ عمر بھر جو پریشانیاں اُٹھائی ہیں ہم نے
 تمہارے آئینوں سے طرہ ہائے غم بہ غم آگے
 دل و جگر میں پر افشاں جو ایک موجِ نہیں ہے
 ہم اپنے زخم میں کیے جوتے تھے اس کو دم آگے
 قسمِ جنان سے ہونے کی میرے کھاتے ہیں ناب
 ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

ان فزوں میں جو مخصوص آہنگ ہے اس سے واقعی یہ محسوس ہوتا
 ہے کہ شکوے کی باتیں کوئی کھود کر پوچھ رہا ہے جیسے واقعی کسی کے دل میں
 آگ دہل ہے۔ جیسے واقعی کوئی دردِ عالم کو مستغرق تصور کر رہا ہے۔ جیسے
 واقعی گر یہ سحری امدادِ غمِ شبیں کی کیفیت باقی نہیں رہی ہے۔ دوسری
 منزل میں حلقۂ اشعار اگرچہ حلقۂ موضوعات کو پیش کر رہے ہیں یہ سب
 جمعی طرد پر بحر کا نیا آہنگ ان میں سے ہر موضوع کی صحیح کیفیت کو ظاہر

کر دیتا ہے اور نئیوں محسوس ہوتا ہے کہ غالب نے نئی زمین کا آجنگ
 اسی کیفیت کو ظاہر کرنے کے لئے تخلیق کیا۔ بہر حال غالب نے نئے آجنگ
 کو پیدا کرنے کے لئے نئی زمین کو وجود میں لانے کے بعض تجربے بھی کئے۔
 یہ تجربے موضوع اور فن کی مناسبت اور ہم آہنگی کو نمایاں کرنے کے سلسلے
 میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ غالب نے ان کے ذریعے سے ایک نئے
 آجنگ کو وجود میں لاکر ایک اہم فن کارنامہ انجام دیا ہے۔

رولین و قرانی کے صحیح اور مناسب استعمال نے بھی غالب کی
 غزلوں کے مخصوص وزن و آجنگ کی تخلیق میں نمایاں کام کیا ہے۔ غالب
 رولین و قرانی کے سارے شاعری نہیں کرتے بلکہ شاعری کے سارے روئے و
 قرانی کو تخلیق کرتے ہیں۔ غزل کے فن میں رولین و قرانی کی تخلیق شاعر کا
 بڑا کارنامہ ہے۔ غزل کا فن ایسا ہے کہ بعض شاعر اپنے آپ کو صرف تانیہ
 پیائی تک محدود کر لیتے ہیں۔ چنانچہ شاعری اور اس کا فن تو اس کا ساتھ
 چھوڑ دیتا ہے اور اس کی جگہ ان کے یہاں صرف تانیہ پیائی رہ جاتی ہے۔
 غالب کی شاعری ظاہر ہے کہ تانیہ پیائی نہیں ہے۔ وہ شاعر میں اس
 لئے رولین و قرانی کا استعمال انہوں نے ایک شاعر کی حیثیت سے
 کیا ہے۔ اور ان کے نظائر و شعور نے رولین و قرانی کے اس استعمال
 میں بڑے پہلو پیدا کئے ہیں، اور اس کو ایک فن بنا دیا ہے۔ یہی
 وجہ ہے کہ غالب کی شاعری میں رولین و قرانی کے استعمال کی نئی حیثیت
 پڑھنے والے کو قدم قدم پر اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ غالب ان کے
 استعمال سے اپنے فن میں وزن و آجنگ کی نئی دنیا نہیں پیدا کرتے ہیں۔
 ان سے ان کا آجنگ زیادہ دور دار ہو جاتا ہے۔ اس میں زیادہ جان

ہدیا ہو جاتی ہے۔ زیادہ مکرّم کیفیت کا وجود ہوتا ہے۔ زیادہ موسیقیت اور فطرت کے پہلو نمایاں ہوتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کی وجہ سے معنویت کا اظہار زیادہ پہلو دار طریقے سے ہوتا ہے۔ غالب کی یہ غزلیں ردیف و قوافی کے مناسب اور مناسب استعمال کی بہترین مثالیں ہیں۔

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جھل گیا
آتشِ خاموشی کی مانند گر یا جھل گیا

سناکش گر ہے زاہد جس قدر اس باغِ رضاں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاقِ نیاں کا
کیا آئینہ خانے کا وہ نقشِ تیرے سب سے
کرسے جو پر تو نورِ شید عالمِ شبستان کا
نظر میں ہے ہماری جاوہِ راویں غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالمِ اجندا سے پریشان کا

دوست غمِ خواری میں میری سی فزائن گے کیا
زغم کے بڑھنے تک ناخنِ زبرمہ بایں گے کیا

ہوس کو ہے نشاطِ کار کب کب
نہ ہو مرنے تو بجئے کا مزہ کب

دور و منست کش دورا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

میں اور بزمِ سے سے تشنہ کام ہوں
گرمیوں نے کی تھی تو ہر ساق کو کیا ہوا تھا

ہوئی مدت کو غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کتنا کریں ہوتا تو کیا ہوتا

جوڑے باز آتے پر باز آئیں کب
کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلاؤں کب

حقِ غمِ زے کی کشاکش سے چٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ حبس میرے بعد

ہے میں کو ہر اک ان کے شمارے میں نشانِ اد
کوٹنے ہیں محبت تو گزرتا ہے گناں اور

رخِ تھار سے ہے سوزِ جاودا کی شمع
ہوئی ہے آتشِ محو اب زندگانی شمع

آہ کو چاہے اک حراثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

ہے کس قدر ہلک فریب ہوا سے گل
بیکل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ڈائے گل

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش ازیک نفس
بقی سے کرتے ہیں روشنی شمعِ ائمِ خاندِ ہم

وہ سسراق اور وہ دھماکا کساں
وہ شب و روز و ماہ و سال کساں

مربان ہو کے بلاو لے چاہو سہس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی سکوں

ہم سے کھل جاؤ بہ وقت سے ہستی ایک
دن ہم پیٹری لگے رکھ کر گذشتہ ایک دن

پترے تو کس کو مہا باندھتے ہیں
ہم بھی مسنون کی برا باندھتے ہیں

دائم پڑا ہوا ترسے دور پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی چہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

سب کمان کچھ لار و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا سورتیں ہوں گی کہ پھناں ہو گئیں

واستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجئے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

گئی وہ بات کہ ہو گنگو تو کیوں کہ ہو
کے سے کچھ نہ ہوا پھر کہ تو کیوں کہ ہو

کسی کو دے کے دل کوئی فراموش نہاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی پہلو میں تو پھر نہ میں زبان کیوں ہو

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک تلوہ غم وہ بھی
سُور جتا ہے بانڈا نہ چکیدن سرنگوں وہ بھی

درد سے میرے بے تھک کو بیقراری اتنے اتنے
کیا ہوئی غلام تری غفلت شمای اتنے اتنے

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی ہیں
میری وحشت تری شرارت ہی ہیں

دیکھتا قسمت کو آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

کوئی دن گر زندگان اور ہے
اپنے جی میں ہم نے عسائی اور ہے

دلِ نادان تجھے ہوا کب ہے
آخر اس ور د کی دوا کب ہے

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے
سینہ جو یائے زخیم کاری ہے

نہ ہوئی گزمرے مرنے سے قتل نہ ہوئی
امتحان اور بھی باقی ہیں تو یہ بھی نہ ہوئی

ہر ایک بات ہے کہتے ہر دم کہ تو کب ہے
تھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کب ہے

کب وہ سنتا ہے کہانی میسری
اور پھر وہ بھی زبانی میسری

نکتہ چینی ہے غمِ دل اس کو شائے زبے
کیا بنے بات بہاں بات بنائے زبے

دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہے
ہوا رقیب تو ہونا مر بُر ہے کیا کہے

کبھی ٹپکی بھی اس کے جی میں گر آجائے ہے مجھے
جفا تیں کر کے اپنی یادِ شرابائے ہے مجھے

باز یہیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شبِ دروز تھا مرے آگے

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہے
مہتیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہے

بہت سہی غم گیتی شراب کم کیا ہے
غلام ساقی کو شرابوں مجھ کو غم کیا ہے

مَدّت ہوتی ہے بار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزمِ چراغاں کئے ہوئے

یہاں غالب کی مختلف غزلوں سے صرف ایک ایک شریقت کیا گیا ہے۔ صرف اس خیال سے کہ ان کی غزلوں میں ردیف و قوافی کے استعمال کی فنی حیثیت کی وضاحت ہو جائے۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ غالب کے یہاں ردیف کے ساتھ ہر شعر میں جو تافیہ استعمال ہوتا ہے وہ ایک نئے آہنگ کو پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن جو اشارہ اوپر نقل کئے گئے ہیں ان سے غالب کی شاعری میں ردیف و قوافی کے استعمال کی فنی کارنامہ اہمیت واضح مزور ہو جاتی ہے۔ غالب کے ردیف و قوافی بے مابا جمل گیا، گویا جمل گیا، باغِ رضوان کا، طاقِ نسیان کا، شبستان کا اجڑے پریشاں کا، فرامیٹیں گئے کیا، بڑھ آئیں گے کیا، نشاط کار کیا کیا، جیسے کا مزہ کیا، دوا نہ ہوا، برا نہ ہو، ساقی کو کیا ہوا تھا، کیوں ہوتا تو کیا ہوتا، باز آئیں کیا، دکھلائیں کیا، چٹا مرے بعد، اہی جہنا مرے بعد، نشان اور، گمان اور، جاوداۃً شیخ، کاروائیِ خُش، اثر ہونے تک، سر ہونے تک، ہوائے گل، خندہ ہائے گل، ماتمِ خانہ ہم وصال کہاں، ماہ و سال کہاں، آجی نہ سکوں، سے پرستی ایک دن، عذر مستی ایک دن، صبا باندھتے ہیں، ہوا باندھتے ہیں، دور پر نہیں ہوں میں، پتھر نہیں ہوں میں، مایاں ہو گئیں، پنہاں ہو گئیں، محبت ہی کیوں نہ ہو، صداقت ہی کیوں نہ ہو، ہو گشتگو تو کیونکر ہو، کہو تو کیونکر ہو، فغان کیوں ہو، زبان کیوں ہو، خون وہ بھی، سرنگوں وہ

بھی، بے قراری آئے آئے، غفلت خدائی آتے آتے، وحشت
 ہی ہی، شہرت ہی سی، آجائے ہے، دیکھا جاتے ہے، زندگی
 اور ہے، ٹھانی اور ہے، مہا کیا ہے، وہ کیا ہے، بھیراری
 ہے۔ دھم کاری ہے، قحی نہ بھی، یہ بھی نہ سی، ڈ کیا ہے گنگو
 کیا ہے، کمانی میری زبانی میری نائے زبے، بتاتے زبے
 بشر ہے کیا کئے، نامہ بر ہے کیا کئے، آجائے ہے مجھ سے،
 شرما جائے ہے مجھ سے، دنیا میرے آگے، ناشامرے آگے،
 مدعا کئے، کیا کئے، کم کیا ہے، مہا کئے ہوتے، چہراناں
 کئے ہوتے، جس آہنگ کو پیدا کرتے ہیں، اس کو حرف محسوس
 ہی کیا جاسکتا ہے۔ ان کی روئیں یہ ذات خود بھی اہم ہیں اور
 ان میں بھی ایک فنگی اور موسیقیت پائی جاتی ہے لیکن قافی
 کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر تو ان کی موسیقیت اور فنگی میں کچھ
 اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور ان کے صوتی آہنگ کا اثر براہ
 راست حواس پر ہوتا ہے۔ غالب اس اعتبار سے ایک منفرد
 فنکار اور ایک بہت بڑے خالق محال ہیں۔

غرض غالب کے فن میں وزن و آہنگ کی مختلف صورتوں
 کو بھی نمایاں مقام حاصل ہے۔ انہوں نے اس وزن و
 آہنگ کو جابجائی انہار کا ذریعہ اور وسیلہ بنایا ہے۔ انہوں
 نے موزون اور مواد کی مناسبت سے اس وزن و آہنگ کی
 تشکیل کی ہے اور اس سلسلے میں بحر و مناسب انتخاب

الحفاظ، ترکیبوں، فقروں اور محلوں کی متناسب تراش و تراش،
 رویت و قرانی کا رنگ اور موسیقیت سے بھرپور اشتہال خاص
 طور پر ان کے پیش نظر رہا ہے اور ان سب کے عہد ہی امرج
 سے وہ ایک ایسے وزن و آہنگ کی تشکیل میں کامیاب ہوئے
 ہیں جو ان کے ہایاتی انداز میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے اور
 ان کے فن کا نہایت ہی اہم حصہ ہے۔

دراپے کے اثبات

غالبے اپنے مزاج اور اُفتاد طبع کے اعتبار سے ایک باغی فن کار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے فن میں مبین جہتیں بھی کی ہیں۔ روایت سے بناوٹ کے اثرات بھی ان کے فن میں نظر آتے ہیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود روایت کے اثرات ان کے فن پر بٹے گھرے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ ان کے فن کی جڑیں روایت کی زمین میں دُر دُر تک پھیلی ہوئی ہیں اور ان کے فن کا تناور درخت اسی روایت کی زمین سے کسب حیات کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ فضا میں پھیل کر فضا میں پرورش پانے والی گرمی اور روشنی کے ہاتھوں اس میں نئی نئی کوئیلیں بھی پھوٹتی ہیں۔

اس سے قبل اس حقیقت کی وضاحت کی جا چکی ہے کہ غالب ایک متذہب کی پیداوار تھے اور اس متذہب کی روایت کو انہوں

کی جو مثال ملتی ہے اس میں خیال آفرینی، رنگینی، پرکاری اور ایک لطیف رمزیت کے عناصر نمایاں ہیں اور آخر الذکر کے بیان خیال کی جذبی، صافی کی، پیدگی، زبان میں ایک ترشی ہوئی کیفیت اور اظہار میں ایک ابہام کی کیفیت نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ غالب سے قبل اردو شاعری کا ایک دور ایسا گذر چکا تھا جس کے علمبردار میر، سوزا اور درو تھے۔ اور جنہوں نے فارسی کی اس روایت کی دونوں صورتوں کے امتزاج سے ایک نئی روایت کی تشکیل کی تھی جس میں سادگی، روانی اور لطیف رمزیت کے عناصر زیادہ نمایاں تھے۔ غالب کے فن میں ان تینوں کا اثر ملتا ہے۔ ابتدائی زمانے میں وہ بیدل کی روایت سے زیادہ متاثر تھے۔ دہلی دور میں ٹھوس، محنتی، اور نظری کی روایت کے اثرات اس اثر میں بلی مل گئے اور آخری دور میں میر و سوزا کی روایت کے اثرات بھی اس میں شامل ہو گئے۔ غالب کے فن میں شری روایت کی ان مختلف صورتوں کا ایک حسین سنگم ملتا ہے۔

یہ بات اس سے قبل بھی کہی جا چکی ہے کہ غالب کا زمانہ فن اجتہاد کا زمانہ تھا اور اس فن اجتہاد کے عوامل و محرکات اس زمانے کے وہ سیاسی، معاشرتی، تہذیبی اور فکری حالات تھے جنہوں نے اس وقت کی زندگی کا نقشہ ہی بدل دیا تھا۔ غالب اور ان کے ہمعصرین کے فن میں جو ایک نیا رنگ و آہنگ نظر آتا ہے اس کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ ان سب نے اپنے اپنے دائرے میں یہ کرنا ہی روایت میں ایک اجتہادی شان پیدا کی ہے۔ غالب بھی اس کام میں پیش

پیش پیش رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں ان سے قبل کی فنی روایت بعض نئی صورتیں بھی اختیار کرتی ہے لیکن ان صورتوں میں کوئی انقلابی رنگ و آہنگ نظر نہیں آتا۔ بلکہ مردہ روایت کو نئے حالات سے ہم آہنگ کر کے ایک نئی شکل دینے اور اس کو زیادہ سے زیادہ نکھارنے اور سوانے کی طرف توجہ دکھائی دیتی ہے۔ غالب کا فن اس اعتبار سے منفرد ہے۔ کیونکہ چلدا نے اسی روایت میں زیادہ ترخی ہوئی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ اور یہ ان کا بہت بڑا فنی کارنامہ ہے۔

اس کی شائیں ترغاب کی شاعری اور ان کے فن میں ہر مبالغہ نظر آتی ہیں لیکن اپنے بعض اشار میں کچھ نظریاتی اور اصولی باتیں انہوں نے ایسی کہی ہیں جن کو سامنے رکھا جائے تو غالب نے روایت کا جو اثر قبول کیا ہے اور اس میں ایک اجتہادی شان پیدا کر کے اس کو جو ایک نئی صورت دی ہے اس کی صحیح تصویر انہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ یہ اشار ان کے نظریات کے صحیح ترجمان ہیں

مکتا ہوں اسد سوزشیں دل سے خون گرم
تارکے زکے کوئی میرے حرف پر انگشت

وہی اک بات ہے جو باں نفس دس نکست لگی ہے
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

سازد نہیں ہے نثرِ منکرِ سنہی بے
ترباکیِ تسلیم ہوں دودِ چراغ کا

ہوں گرمیِ نشاطِ قصور سے نثرِ سنہی
میں حندیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

آتے ہیں غیب سے یہ مضاہیں خیال میں
غالب سریرِ خامرِ نواب سے سرور میں ہے

پاتا ہوں داد اس سے کچھ اپنے سخن کی میں
روح القدس اگرچہ مرا ہم زبان نہیں

میں جو گستاخ ہوں آنجہ غزلِ غانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرمِ ذوقِ فزا ہوتا ہے

ذلتِ کش کی تہا نہ ہلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں سنی نہ بھی

آگہیِ دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچاتے
معاذتا ہے اپنے عالمِ قزیر کا

میں زرد پاشی سنی دور ہے امد
پہلے دل گمانتہ پیدا کرے کوئی

گھٹا کسی پر کیوں مرے دل کا مسام
شروں کے انتخاب نے رُسا کب بجے

نہ اُنہ غم کو ہی اسے دل غنیمت مانتے
بے صدا ہو جائے گا یہ ساؤ مہستی ایک دن

سندباد کی کوئی نے نہیں ہے
نار پابند نے نہیں ہے

پیغزل اپنی بجے ہی سے پند آئی ہے آپ
ہے روہینہ غریب غالب زہیں مکرار دوست

کچھ تو کیجئے کہ لوگ کسے ہیں
آج غالب غنڈل سرا نہ ہوا

ہمارے شر میں اب مرن دل لگی کے امد
کھلا کہ فسادِ خونِ بہن میں خاک نہیں

ہیں اور بھی موندیا میں شہور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

ادائے خاص سے غالب سہا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یا راہِ نکتہ داں کے لئے

جو یہ کہے کہ رینہ کیونکہ ہر رشکِ غامی
گفتہ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کر یوں

بعدِ شوق نہیں طرفِ تلک سے عزلی
کچھ اور چاہئے دستِ مری زباں کے لیے

معتد ہے تاز و غزوہ دے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشتِ خنجر کے بنیہ

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
نتی نہیں ہے بادۂ سامند کے بنیر

یہ اشعار بنیر کسی ترتیب کے، صرف یادداشت کے سہائے
ہیں نقل کئے گئے ہیں، ان کو پڑھ کر جو نتائج نکلتے ہیں وہ یہ ہیں
کہ غالب نے سوزِ شبنمِ دل سے سنی کرم کی تخلیق کی ہے۔ ان کی

لفز سنجی گرتی نشاۃ تصور کی مَر جوں منت ہے ۔ ان کا دل گداخت
 ان کی شاعری کا بیج ہے ۔ ان کا انداز بیان منفرد ہے اور وہ ایک
 ادائے خاص سے ہمکتہ سرا ہوئے ہیں ۔ انہوں نے ریختے کو رشکِ خدای
 بنا دیا ہے ۔ عرفِ مہنگنائے غزل ان کے لئے کافی نہیں ۔ ان کی زبان
 کے لئے تو کچھ اور دستیں درکار ہیں ، انہوں نے ناز و غمزہ کی گنگو
 و مشر و دھنریں اور شاہدِ حق کی گنگو ، باد و ساغر میں کی ہے ۔
 اور ان سب باتوں کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے شاعری اور فن کی
 مروج روایت سے استفادہ کیا ہے اور اس کو نئے لغزات اور نئے
 اسایب سے آشنا کرنے کی کوشش بھی کی ہے ۔ ان کا جمالیاتی اظہار
 اور فی اس صورت حال کی پوری طرح عکاسی کرتا ہے ۔

غالب غزل کے فن کار ہیں اور غزل کی کئی سو سال کی فنی روایت
 کو انہوں نے اپنے فن میں بڑے سلیقے سے برتا ہے ۔ غالب جہاں تک
 ان کے خیالات و نظریات کا تعلق ہے ۔ ایک انعکاسی ہیں ۔ ان کا اصل
 نیا ہے ۔ ان کے خیالات میں جذبہ ہے ۔ ان کے تقریبات بھی نئے ہیں ۔
 لیکن ان سب کا اظہار انہوں نے اس طرح کیا ہے کہ غزل کی روایت
 کو ان کی شاعری میں خمیس نہیں گنتی ۔ عشقیہ فضا ، غزل کی روایت کی بنیاد
 ہے ۔ غالب نے اس عشقیہ فضا کو اپنے فن میں برقرار رکھا ہے ۔ حسن
 کی کیفیت ۔ محبوب کے حسن کا عالم ۔ اس کے ساتھ عاشق کے روابط ۔ اور
 پھر ان روابط کے نتیجے میں عاشق کی حالت ۔ ان سب کی تفصیل غالب
 نے اسی انداز میں پیش کی ہے جو غزل کا مخصوص انداز ہے اور جس
 کو اس روایت کے علم برداروں نے ہر دور میں برتا ہے ۔ عاشق
 کا محبت نما ہونا ، اکے کو چاہیں جا لیکن اکے دید کا نصیب نہ ہونا ، رقیب کا عاشق

کے راستے میں حائل ہونا، اس کے کوچے میں جانا، لیکن اس کے
 دیدار کا نصیب نہ ہونا، رقیب کا عاشق کے راستے میں حائل ہونا
 عاشق کا رشک سے مرنا، نامح کا نصیب کرنا لیکن عاشق کا اس نصیب
 کو درخور اعتبار نہ سمجھنا، نامہ بر کے ہاتھوں نامہ و پیام کا سلسلہ
 جاری رکھنا لیکن ناکام ہونا اور پھر صحرایہ طوفان بھانگا اور ہاتھ
 تھکا جو جانا۔ یہ اور اس قسم کی بے شمار باتیں غائب نے اپنی
 شاعری میں غزل کی روایت کے سہارے پیش کی ہیں۔ اور اس
 طرح غزل کے فنی تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ یہ اشعار اُن کے اس
 فنی میلان کی صیح ترجمانی کرتے ہیں۔

سے حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یقین
 ہم نے بار بار ڈھونڈا، تم نے بار بار پایا

شورِ پندِ نامح نے زخم پر تک چھڑکا
 آپ سے کوئی پڑچھے تم نے کیا مزا پایا

احیاء چارہ سازیِ وحشت نہ کر کے
 زنداں میں بھی خیالِ بیاباں نروستا

یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
 حقِ منفرد کرے عجب ازادِ مردِ مہتا

سبزہ خط سے برا کا کل سرکش نہ دیا
 یہ زمرہ بھی حریف دم افنی نہ ہوا
 میں نے چاہا تھا کہ اندوہ و فاسے چھوٹوں
 وہ تھکڑے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

بنی میں خیر کی آپ آج سسے میں کیس حد
 سبب کیا خواب میں آکر تبسم لئے پنہاں کا

در پہ رہنے کو کہا اور کہ کے کیا چرگ
 تجھے عرصے میں مراپا ہوا بستر کھلا

غیوں میں میری نش کو کینے پھر دو کی
 جاں دادہ ہوائے سر و نگہ دوست

حضرت ناصح گو آئیں دیدہ و دل خوش راہ
 کوئی بے کر یہ تو بھاؤ کہ بھائی گے کب
 آج وہاں تیغ و کئی ہانے پہنچ جاتا ہوں میں
 حذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

گر کیا ناصح نے ہم کو قیدِ اچھا یوں ہی
 یہ جن جن عشق کے انداز چٹ جائیں گے کب

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بے میں دوست نامیج
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غلگسار ہوتا

اے قوموں سوتے میں اُس کے پاؤں کا ہر گر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تھا شا ہوا گلو نہ ہوا

کے میٹریں میں تیرے لب کو رقیب
گایاں کہا کے بد مزان ہوا

پھرتے کرچے کو جاتا ہے خیال
دلِ کم گشتہ مسگر یاد آ یا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد
جگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آ یا

ریشم کتا ہے کہ اُس کا غیر سے اعلا میں حین
حق کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

سویا خوں سرے گذر ہی کیوں نہ جائے
 آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا
 بدچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
 کوئی تلوڑ کہ ہم بستلیں کیا

آتے ہے بے کسی عشق پر رونا غالب
 کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

سرمجھڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
 یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

نہ لڑنا سچ سے غالب کیا ہوا اگر اس نے شدت کی
 ہمارا بھی تو آخر زور چھٹا ہے گریبن پر

ہوں گرفتار الفتِ صبا
 ورنہ باقی ہے طاقت پر داز

دُحول و حیا اس سراپا ناز کا شہرہ نہیں
 ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیشِ دکن ایک دی

تھک کے آتے آتے خطا اک اور کچھ رکوں
 میں جانتا ہوں جو وہ نکلیں گے جواب میں
 مجھ تک کب ان کی بزم میں آیا تھا دویر جام
 ساقی نے کچھ ملا دیا ہر شراب میں

خدا شرابے باخترن کو رکھتے ہیں کشاکش میں
 کبھی میرے گریباں کو کبھی جانیں کے دامن کو

رہے اس شوق سے آزد وہ ہم چہتے تکلف سے
 تکلف بر طرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

یار سے چھیڑ چلی جائے اسد
 گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

سادگی پر اس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے
 بس نہیں چلتا کہ چہر خضر گفت ناکی میں ہے

(۱) اشار میں غزل کی روایت کا صحیح مزاج قضا ہے۔ یہ سب کے
 سب کا دوبار شوق کے آئینیں پہلوؤں کے ترجمان اور عکاس ہیں جن کو
 غزل کی روایت ایک مخصوص انداز میں پیش کرتی ہے۔ ان میں مجموعی
 طعن پر ایک مخصوص قضا ہے جس کو غزل کی روایت ہر صورت اپنے

پیش نظر رکھتے ہے۔ ان میں کہیں عاشق کا دل گم ہوتا ہے کہیں
 نامح اپنی نصیحت سے اس کے زخموں پر ٹھک چھڑکتا ہے لیکن
 اس کے باوجود عاشق محبوب کے کوچے میں جاتا ہے، اس کی
 دیوار کے سائے تلے بیٹھتا ہے بلکہ اس سے سر چھوڑتا ہے۔ قیوں
 سے اس کی ٹوک جھونک رہتی ہے۔ فیروں کا وہ شکوہ کرتا ہے۔
 لیکن محبوب اس شکوے پر کان نہیں دھرتا۔ وہ غیر کی نعل میں سوتا
 ہے۔ عاشق اس کے در کے سائے بستر لگاتا ہے۔ پاسباں اس کو
 آڑے ہاتھوں دیتا ہے لیکن وہ توتیخ و گھنہ بازہ کر گھر سے نکلت
 ہے تاکہ محبوب اس کو قتل کر دے۔ یہ اور اسی قسم کی دوسری
 باتیں جو ان اشار میں بیان کی گئی ہیں ان میں غزل کی روایت کے
 اثرات صاف نمایاں ہیں۔ غالب نے اسی روایت کو اس طرح برتا
 ہے کہ ان کے یہاں صبح مسخوں میں تنزل کی شان پیدا ہو گئی ہے۔
 اور غالب اس اعتبار سے ایک بہت بڑے فن کار ہیں۔ انہوں
 نے ترنعتوں اور فلسفہ کے موضوعات تک کو تنزل کے سانچے میں
 ڈھال دیا ہے۔ اور مشاہدہ حق کی گفتگو باد و ساغر میں بڑے
 سلیقے سے کی ہے۔ ان کے فن کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ
 وہ اشاروں اور کنایوں میں نہ جانے کیا کیا کچھ کہہ جاتے ہیں۔ رموز
 ایما کے پر سے ہیں زندگی کے دقیق سے دقیق مسائل کو آسان
 بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ تنزل کو تنزل کے
 رنگ میں پیش کرنے کی روایت فارسی اور اردو دونوں میں بہت
 پرانی ہے۔ اس لئے غالب نے اس کو بہت کر کوئی حدت پیدا نہیں

کی۔ البتہ یہ مزدور ہے کہ انہوں نے اعمار و ابلاغ میں بسنے نئے
 پہلو پیدا کئے۔ پرکافی ملاستوں میں نئی مسنویت کو سمویا اور نئی مسنویت
 کے لیے نئی ملاستوں کی تخلیق بھی کی۔ اس طرح عجمی طور پر انہوں
 نے تنزل کی روایت کو ایک نیا اسلوب بھی دیا۔ یہ چند اشار اس
 نئے اسلوب کے بہترین نمونے ہیں۔

سے بقدرِ غزل ہے ساقی غارِ تشنہ کامی بھی
 جو تو دریائے سے ہے تو میں غیاث ہوں مسل کا

عزم نہیں ہے تو ہی نرا یائے راز کا
 یاں درز جو مجاب ہے پردہ ہے ساز کا

بلو از میں کو قنات تے ٹنگ کرتا ہے
 جو ہر آئینہ بھی چاہے ہے مژگان ہوتا

میں اور بزم سے سے ہوں تشنہ کام آؤں
 گر میں نے کی تھی تو بہ ساقی کو کیا ہوا تھا

دا کر دیے ہیں شوق نے بند نقابِ حسن
 غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

بخنے ہے سبدۂ گل ذوق تماشا غالب
چشم کو چاہئے ہر رنگ میں دا ہو جانا

ہے عجب تری سلمان وجود
ذرتہ بے پر تو خورشید نہیں

جب وہ جمال و لغز و صورت مہر نیم روز
آپ ہی ہو نظارتہ سوز پرچے میں مز چھائے کیوں

ان اشعار میں جیسا کہ ان کے مضموم سے ظاہر ہے، نقوت کی باتیں ہیں۔ غالب نے ایک مخصوص اسلوب سے ان میں تنزل کی شان پیدا کر دی ہے لیکن غالب نے اس انداز و اسلوب میں جمالیاتی اظہار کر کے کوئی ایسی جدت نہیں کی جو غزل کی روایت کے خلاف ہو۔ کیونکہ تنزل کے اسلوب میں مسائل نقوت کو پیش کرنے کی روایت غزل میں بہت پرانی ہے۔ غالب سے قبل غامدی اور اردو دونوں میں اس روایت کو بڑے سلیقے سے برتا گیا ہے۔ غالب نے اس روایت کو اپنے پیش نظر رکھا۔ البتہ اس کے جمالیاتی اظہار میں بعض جدتیں مزور کیں۔ مثلاً ”تمیازہ ہوں ساحل کا“۔ ”جو جہاب ہے پروہ ہے ساز کا“۔ ”جو ہر آئینہ بھی چاہے ہے مرزاں ہونا“۔ ”وا کر دیے ہیں شوق نے بندہ نقاب حسن“۔ ”بخنے ہے جلوہ گل ذوق تماشا غالب“۔ ”ذرتہ بے پر تو خورشید نہیں“۔ جب وہ جمال و لغز و صورت مہر نیم روز“

ان سب میں ایسی بہت پائی جاتی ہے، جس سے غزل کی روایت اب تک ناہشنا تھی۔

میں ساری بحث اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ غالب نے روایت کو بڑے سلیقے سے بُرتا ہے اور جاہلیاتی افکار میں اس سے بڑے بڑے کام لئے میں لیکن روایت کو بعض ایسے پہلوؤں سے بھی بکھار کیا ہے کہ اس میں بدعتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غالب نے روایت کو پوری طرح تسلیم نہیں کیا ہے اور اس کے بعض پہلوؤں کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا ہے۔ مثلاً غزل کے بعض مضامین کے جاہلیاتی افکار کا روایتی انداز انہیں پسند نہیں ہے اس لئے ان کے کام میں جب یہ مضامین آتے ہیں تو ان کے یہاں شوخی اور طنز و مزاح کا پہلو پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ غالب کو یہ انداز بھاتا نہیں۔ اس لئے وہ اس کو پیش کرنے میں طنز سے کام لے رہے ہیں۔ بلکہ اس روایتی انداز کا مستحکم اثر رہے ہیں۔

غزل کی شاعری اس صورت کو برداشت نہیں کر سکتی کیونکہ وہ (جیسا کہ راقم نے آج سے چند سال قبل ایک مضمون میں لکھا تھا) سوز و گداز کی شاعری ہے اور شوخی کو گوارا نہیں کرتی۔ لیکن غالب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے اس شوخی کو غزل کے لئے گوارا بنا دیا ہے اور وہ ان کی غزلوں کا ایک لازمی جز نظر آتی ہے۔ اس شوخی کا پتر ان کے یہاں حسن کے باریں میں بھی چلتا ہے۔ محبوب اور محبت کرنے والے کے جو روابط ہیں، اور ان کے نتیجے میں جو رسالت

پیدا ہوتے ہیں، ان میں بھی اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ عشق اور کاروبار شوق کی جو تفصیل انہوں نے پیش کی ہے اس میں بھی شوقی کا عنصر کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ اس عشق کے جو نتائج نکلتے ہیں اور اس کا جو انجام ہوتا ہے، اس کی حقیقت میں بھی یہ شوقی اپنا اثر دکھاتی ہے۔ غرض غالب کسی جگہ بھی اس شوقی کو اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ بلکہ اس سے خاطر خواہ کام لیتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کے ایسا کرنے سے غزل کے کارگر شیش گری کو صیقل نہیں ملتی۔ یہ آگہیز اس تہذیبی ماحول سے نکلتا نہیں۔ اس کی آب و تاب پوری طرح باقی رہتی ہے۔ بلکہ اس میں جو شراب ہے اس کی مستی میں کچھ اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے اور اس کے ظاہری رنگ میں کچھ اور بھی تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان دونوں چیزوں سے دل کو سرور اور آنگھوں کو ناز ملتا ہے۔

لیکن غالب کے کلام میں یہ شوقی اسی جگہ اپنی انتہائی ہندوں پر نظر آتی ہے جب وہ فی کے روایتی انداز پر براہ راست یا باواسطہ طنز و مزاح کے تیر و تشر جلاتے ہیں۔ یہ اشار ان کے فی کے اس رجحان کی ترجمانی کرتے ہیں۔

اس سادگی پر کون ذمہ جاتے اے خدا
رہتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

ہے کیا جو کس کے ہاتھ میں یہی پادوسہ
کیا جانتا نہیں ہوں تہذیبی لکڑ کو میں !

لاؤ اتنا ہیں کہ اگر تو بزم میں جاوے مجھے
میرا ذہن دیکھ کر اگر کوئی بتا دے مجھے

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے میرے تھی
سُن کے ستمِ ظریفین نے مجھ کو اشادِ پاکِ یوں

گدا کجھ کے وہ چپ تھا جو مری شامت آئی
اشاد اور آٹھ کے قدم میں نے پاہاں کے لئے

وہ وہ جس قدر ذلتِ ہمِ ہنسی میں نامیں گے
بارے آشتا نکلا اُن کا پاسباں اپنا

دل ہی تو ہے سیاست و دربان سے ڈر گیا
میں جاؤں اور وہ سے ترے ہی صدا کئے

دور رہنے کو کہا اور کہ کے کیا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا پٹا ہوا بسرِ غم

مگر کھوئے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر دیکھ کر تسلیم تھکے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کو مفت آنے تو مل اچھا ہے

چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھ چاہتے

دن اشعار میں جو شرفی ہے ۔ اس میں طنز و مزاح کا پہلو بہت نمایاں
نظر آتا ہے ۔ اور ان کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ غالب نے
غزل کے ان روایتی مضامین کو تجدیدگی کے ساتھ پیش نہیں کیا ہے ۔
بلکہ وہ ان کے مضحکہ خیز پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔
محبوب کا بیڑ تلوار کے ڈٹانا اور محبت کرنے والے کا اس کی اس سادگی
پر غرنا ۔ محبوب کا کمر کو کس کے بازو میں محبت کرنے والے کا اس
سے زور ڈرنا ۔ محبت کرنے والے کا اتنا لاغر ہو جانا کہ کوئی اس کو دیکھ
کر تپا نہ سکے ۔ محبوب کا محبت کرنے والے کو بزم سے اٹھا دینا ۔ محبت
کرنے والے کا محبوب کے کوچے میں جانا اور گدا گد کے پاسبان کا
اس کو آٹھے اٹھتوں دینا ۔ سیاست و دربان سے دل کا ڈر جانا ۔ محبوب
کا محبت کرنے والے سے دور رہنے کے لئے کتنا یکن بستری کھینے
جی اس کا اپنے قول سے پھر جانا ۔ محبت کرنے والے کا صبح کو
کان پر قلم رکھ کر نکلنا تاکہ اسے خط لکھنے کا موقع ملے ۔ محبوب کا
بوسہ نہ دینا اور دل کو مفت کا مال کبھو کہ اس پر لنگہ دیکھ کر بیدار
کو چاہنا لیکن اپنی صورت کی بے صورتی کو محسوس نہ کرنا ۔ یہ تمام

مضامین ایسے ہیں جو غزل کے روایتی مضامین ہیں۔ غالب کو ان کی بے کیفی کا احساس ہے۔ وہ ان کو پسند نہیں کرتے۔ اسی لئے انہوں نے طنز و مزاح کے رنگ میں ان کو پیش کیا ہے لیکن ان کے اس انداز نے ان کے فن میں ایک ایسا نیا پہلو پیدا کر دیا ہے جو اردو کے کسی دوسرے غزل گو شاعر کے بیاں نظر نہیں آتا۔

غرض روایت نے غالب کے فن میں کچھ ایسے پہلو پیدا کئے ہیں جو غزل کے فن کی روایت میں اضافہ ہیں۔ اور جن کی وجہ سے غالب کا فن نئے آسمانوں پر پرواز کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

غالب کے فنی ہیں جو چیز سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے
 وہ ملائکہ کا استعمال ہے۔ اُن کی شاعری ملائکہ کا ایک ٹرقتے ہے۔ انہوں نے
 اُن جگہ ملائکہ کو نئی زندگی دی ہے۔ وہ ملائکہ کی اہمیت کے قائل ہیں
 انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا ہے۔ جب وہ کہتے ہیں کہ مشاہدہ حق کی گفتگو
 بادۂ وساخر میں امد ناز و غمزہ کی بات دشتِ دشمن میں ہونی چاہئے تو
 گویا شاعری میں ملائکہ کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔

ہر جہز ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
 نہی نہیں ہے بادۂ وساخر کے بنیہ
 مقصد میں ناز و غمزہ دے گفتگو ہی کام
 ہوتا نہیں ہے دشتِ دشمن کے بنیہ

لیکن غالب کے اس بیان میں علامتوں کو صرف انہماک و ابلاغ کا ایک ذریعہ اور وسیلہ بتایا گیا ہے۔ اُن کی جذباتی اہمیت کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ غالباً غالب اس کا شعور نہیں رکھتے تھے لیکن عملی طور پر انہوں نے اپنی شاعری میں علامتوں کو کسی جذبے کی ترجمانی کے لئے استعمال کیا ہے اور اس میں اُن کی کوئی شعری کوشش شامل نہیں ہے۔ اُن کا جذباتی تجربہ ان علامتوں کو تھیل کرتا ہے۔ یہ ادب بات ہے کہ وہ ان کے جالیاتی انہماک میں بھی حسن آفرینی کا باعث بنتے ہیں۔ غالب خود انہیں شعری طور پر اپنے محاسباتی انہماک کے لئے تخلیق نہیں کرتے وہ قرآن کے خفیلق مزاج کا ایک فطری عمل ہے۔ ڈبیر۔ بی۔ پیش نے شاعری کی علامتوں کی اہمیت پر شاید سب سے اچھی نظریاتی بحث کی ہے اور عملی طور پر بھی اپنی شاعری میں ان اصل اور نفوذات کو برتا ہے۔ ہمیں کا خیال ہے کہ علامتیں شاعری میں ایک بہت بڑی طاقت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان سے نہ صرف اس میں زور پیدا ہوتا ہے بلکہ وہ اس کو پہلو وار بن کر اس میں حسن بھی پیدا کر دیتی ہے۔

علامتوں کا مطلب ہے تجربات کا انہماک اس طریقے سے کریں کہ اس سے بہتر انہماک ممکن نہ ہو سکے۔ ان علامتوں کے سہارے یقیناً شاعر کے پیچیدہ تجربات کا انہماک بہتر طریقے سے سمجھ طور پر حسین پیرائے میں ہوتا ہے۔ یہ علامتیں کہیں کہیں شاعر کے جالیاتی انہماک کو محبوبہ مرد پر پیچیدہ بھی بنا دیتی ہے لیکن اس کی پیچیدہ کیفیت نہ داری تک محدود رہتی ہے اس لئے اس میں احساس جمال کی

نسکین کا بڑا سامان ہوتا ہے۔

غالب نے بھی اپنے ہیچیدہ اور تہہ در تہہ تجربات کے اظہار کیلئے علامتوں کو استعمال کیا ہے اور یہ علامتیں ان کے یہاں ایک طاقت بن گئی ہیں۔ ان علامتوں کی وجہ سے ان کے فن میں زندگی اور جوفانی نظر آتی ہے اور جالیان اظہار کے لئے ایک نئے انداز کا تجربہ ہوتا ہے۔ اردو غزل کی روایت میں شاید غالب پہلے فن کار ہیں جن کے یہاں علامتوں کا استعمال ایک باقاعدہ نظام کی صورت میں ملتا ہے اور اس اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ پہلے باقاعدہ علامت نگار شاعر نظر آتے ہیں۔ انہوں نے مُردجہ علامتوں کو بھی استعمال کیا ہے اور ان کے جسم میں نیا حزنِ زندگی دوڑا کر ان سے بڑے بڑے کام لئے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے بے شمار نئے علامتوں کی تخلیق بھی کی ہے۔ ان نئے علامتوں کی تخلیق میں ان کی کسی شعری کوشش کو دخل نہیں۔ ان کا وجود قرابت کے تہہ دار اور ہیچیدہ تجربات کا سرچرچ بنت ہے

غزل کی روایت میں جو مُردجہ علامتیں موجود ہیں اور جن کو غالب سے قبل نادرسی اور اردو غزل دونوں میں استعمال کیا گیا تھا، ان کو غالب نے بڑے سلیقے سے استعمال کیا ہے اور ان میں زندگی کی ایک نئی لہر بھی دوڑا دی ہے۔ نئے پہلو بھی ان میں نکالے ہیں اور کچھ نئے دسئیں بھی ان میں پیدا کر دی ہیں۔ یہ اشعار دیکھئے

دل گزر گا و خیالو سے دساعندہ ہما سہی

گر نفس جادۂ سر منزلِ تقویٰ نہ ہوا

محبت تھی جن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے
 کہ مرچ ہوئے گل سے ناک میں آتے دم میرا

بغد و غم ہے ساقی خارِ تشنہ کا می بھی
 جو تو دور لیتے ہے تو میں خمیازہ ہوں سال کا

جلدِ گل نے کیا تھا داں چراغاں آب جو
 یاں رداں مژگانِ چشمِ ناز سے طربِ ناب تھا

آج داں تیغِ دکنِ باندھے ہوئے جاتا ہوں
 غمِ میرے نقل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

گر کلا نامیج نے ہم کو قید اچھا یوں سہی
 یہ جہیزِ عشق کے اغاز چھٹ جاتیں گے کیا

وہی اک بات ہے جہاں نفس داں نکلتے گل ہے
 چمن کا جلدہ باعثِ نہ ہے مری رنگیں نواں کا

باغ ہی مجھ کو نہ لے جاوے میرے حال پر
 ہر گل تراکیہ چشمِ ٹٹن نشان ہر جگہ کا

میں اور بزمِ نئے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی سچی قربانی کر کیا ہوا تھا

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پر ٹل خیالِ دہشمن سے دامنِ فغاہ کا

شیخ بھگتی ہے تو اُس میں سے دُھواں اٹھتا ہے
شعلہ کشن سیاہ پوششِ بڑا میرے بعد

ان آہوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہو رہا ہے راہ کو پُرخار دیکھ کر

نہ ٹٹا صبح سے غائب کیا ہوا گر اُس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آئندہ زور چلتا ہے گریباں پر

اسہ سہل ہے کس انداز کا قافی نے کہا ہے :
کہ مشقِ نازِ کر خونِ دو عالم میری گردن پر

ہرں گرفتِ اُفتِ صیت و
در نہ باقی ہے طاقتِ پرواز

مُخَرَّدے ذوقِ اسیری کہ نظر آتے ہے
دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس

آبرو کیا خاک اس شخص کی کہ ٹھٹھن میں نہیں
ہے گریباں نعلِ پیراہن جو دامن میں نہیں

لے گئی ساقی کی نخرتِ تلوم آٹھی مری
سوجھے کی آج رنگِ بیت کی مژدگی میں نہیں

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خواب
سو گز زمین کے بدے بیاباں گراں نہیں

مانعِ دشتِ فردی کرتی تدبیر نہیں
ایک چکرتے سے پاؤں میں زنجیر نہیں

مجھ تک کب اُسی کی بزم میں آنا سدا و درِ جام
ساقی نے کچھ علائقہ دیا ہو شراب میں

کم نہیں وہ بھی خرابی میں پر وسعتِ معلوم
دشت میں ہے بے وہ عیش کہ گریباں نہیں

قصہ میں مجھ سے روادہ نہیں کہتے : ڈرہم
گر ہی ہے جس پہ کال بھی دو میرا آئیاں کیوں جو

خداں کیا فصل کو کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں قصہ ہے اور ماتم ہاں و پر کا ہے

لکھا ہے کون نازِ بقی کو ہے اثر
پڑے ہی گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

اس انجی نازیکی کیا بات ہے غائب
ہم جی گئے واں اور تری تقدیر کو دوائے

پہنل تھا دامِ سخت قریب آئیاں کے
اٹنے نہ پاے تے کو گرفتار ہم ہوئے

ان اشار میں سے ہر ایک میں غزل کی کوئی نہ کوئی مرد
علامت استمال ہوئی ہے لیکن ہر شعر کو پڑھتے ہی اس حقیقت
کا احساس ہوتا ہے کہ اس روایت کا استمال صرف روایتی انداز میں نہیں
ہوا ہے بلکہ اس روایت کے استمال نے ہر شعر میں نئی مصنوعی
دستوں کو سودا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس کے مایاتی اظہار میں

بھی ایک رہی ہوئی کیفیت بھی پیدا کر دی ہے ۔
 مندرجہ بالا اشار میں سے وساعز، ساقی، غارتشہ، کامی،
 بزم سے، تلوام آٹاشی، سوچ سے، دور جام، جلوہ گل چمن، باغ
 گلشن، بکمت گل، خزاں، قنص، صیاد، سرخ گز تار، دشت
 نوردی، بیاباں، زنجیر، بیل، آٹاشیاں، شش، انہن، گرجاں وغیرہ
 کی جو بے شمار علامتیں استعمال ہوئی ہیں، وہ اس میں شبہ نہیں
 کہ روایتی ہیں اور ندی اور اردو میں صدیوں سے رائج ہی ہیں
 لیکن جس طرح غالب نے ان کو استعمال کر کے اپنی سانی و مناسیم
 کی وضاحت کی ہے اور جس انداز میں ان کے استعمال سے اپنے
 فن میں حسن کی اتھار پیدا کی، ہیں وہ روایتی نہیں ہے۔ اس میں
 ایک جدت ہے۔ ایک اچھوتا ہی ہے اور اس جہت اور
 اچھوتے ہی کے پیدا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ غالب ان علامتوں
 اور اشاروں کو روایتی حدود میں قید نہیں رکھتے۔ بلکہ انہیں آزاد
 چھوڑ دیتے ہیں۔ اس طرح ان میں معنوی اور فنی دونوں اعتبار
 سے دستیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ان میں کشادگی کے حسن کا احساس
 ہوتا ہے۔

غالب کے فنی میں روایتی علامتوں اور اشاروں کے استعمال
 کا جو نظام ہے، اس میں بھی کہیں کہیں ان سے ملتی جلتی بعض
 نئی علامتیں وجود میں آجاتی ہیں۔ مثلاً گز گز گاہ خیال سے وساعز
 کے ساتھ جادہ سر منزل تقویٰ، غارتشہ کامی کے ساتھ درپائے
 سے اور خیانتہ ساحل، سوچ سے کے ساتھ تلوام آٹاشی، جلوہ گل

کے ساتھ چراغاں، گل تر کے ساتھ چٹم خون قضاں، پاؤں کے
 آہوں کے ساتھ ماہ اور اس کی پُر نثار کیفیت، ذوق اسیری کے
 ساتھ دامن خالی و میزہ کی جو علامتیں اور اشارے ملتے ہیں، ان
 کی وجہ سے گستاخی کے اس حق میں کچھ اور بھی اضافہ ہو جاتا
 ہے جو ان کی روایتی علامتوں اور اشاروں کی نمایاں خصوصیت ہے۔
 یہ صورت غالب کے فن میں اس وجہ سے پیدا ہوئی ہے کہ
 وہ بنیادی طور پر علامتوں اور اشاروں کے شاعر ہیں اور ان کی
 شاعری بے شمار علامتوں اور اشاروں سے آراستہ و پیراستہ نظر
 آتی ہے۔ ان علامتوں اور اشاروں میں سب سے زیادہ اہم وہ
 ہیں جن کی روایت اردو یا فارسی میں غالب سے قبل موجود نہیں
 تھی۔ غالب کے نئے احساس و شعور نے ان کو سب سے پہلے
 تخلیق کیا اور اپنی شاعرانہ فنی کاری سے ان کے استعمال کو عمومی
 بنا دیا۔ مذکورہ ذیل اشعار میں نئی علامتوں اور اشاروں کا استعمال
 غالب کے فنی اجتہاد پر دلالت کرتا ہے۔

شب ہوئی پھر انجم رخشندہ کا منظر کھلا
 اس بھگت سے کہ گویا بت کہے کا در کھلا
 گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دستا کاں تو بہ
 آستیں میں دشنہ پناہ اتھ میں غنجر کھلا
 کیوں اندھیری ہے شب فم ہے بلاں کا نڈل
 آج ادھری کو رہے گا دیدہ آخر کھلا

مقدم سیلاب سے دل کیا نشاۃ آبگ ہے
خازن عاشق مگر سازِ صدا سے آبِ ستھا

خازنِ زادِ زلف ہی زنجیر سے جاکیں گے کیوں
ہی گرفتارِ وفا زلفاں سے گجرائیں گے کیا

قید میں ہے ترے دخی کو وہی زلف کی یاد
اں کچھ اک رنجِ گراں بارِ نئی زنجیر بھی ستھا

مانجِ دُشتِ فردی کوئی تدبیر نہیں
ایک پکڑ ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

رہزنی ہے کہ دلِ رستانی ہے
سے کے دلی دلِ ستاں روانہ ہوا

تھر ہلدا جوڑہ دوستے بھی تو دیراں ہوتا
بھر اگر بھر نہ ہوتا تو بیا باں ہوتا

ہم تھے مرنے کو تھر سے پاس نہ آیا نہ ہی
انہ اس شوق کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

آئے ہے بے کسی عشق پہ رونا غالب
کس کے گھر جائے گا سیلاب بجلا مرے بعد

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک دایرہ کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

کسی روز تمہیں نثرِ اشکے کئے عدد
کسی دن ہمارے سر پہ اُڑے خپلا کئے

نہت کہے میں میرے شبِ غم کا ہوش ہے
اک شیخ ہے دیباہِ سحرِ خوش ہے

وہ بادۂ شہانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیں بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی

پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آدمِ فضیل کا رکاری ہے

کھتے رہے جنوں کی حکایات خون چکاں
ہر چند اس میں اتنا ہمارے قلم بہنے

ہر قدم دوری منزل ہے نایاں مجھ سے
میری رفتار سے جاگے ہے بیاہاں مجھ سے

قد و گیسو میں قیس و کوکب کی آئینش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دلو و رس کی آئینش ہے

محبت جگر سے ہے رگ پر خار شاخ گل
تا چہند باغبانی صحر اکر سے کوئی

(۱) اشار میں حرمات و اخراجات پائے جاتے ہیں وہ
اردو شاعری کے لئے بالکل نئے ہیں۔ مثلاً شب، الجہم، رخشندہ،
دیوانہ، دشنہ و خنجر، سیلاب، زنجیر، زنداں، رہزنی، ہجر، بیاہاں
دشت، تیر و گیش، تیز رو، رابہر، رہزنی، آرد، خواب سحر، غفلت کوا
دلیل سحر، فصل لاد کاسی، جنن، حکایات خوں چکاں، دوری منزل،
بیاہاں، دلو و رس، باغبانی سحر و فیرو کی ملائیں اور اشار سے ایسے ہیں
جی سے اردو شاعری غالب سے قبل نا آشنا تھی۔ غالب نے ان
کو اپنے گھر سے، وسیع، برگیر اور پیچیدہ تجربات کے انبار کا
ذریعہ اور وسیلہ بنایا۔ اس طرح ان کی تخلیق عمل میں آئی اور
ان علامات و اشارات نے اردو شاعری میں نئی اعتبار سے ایک
انتخاب پیدا کر دیا۔

سال میاں ۷ پیدا ہوا ہے کہ غالب نے پرانی علامتوں میں

نئی زندگی کیسے پیدا کی اور نئی علامتوں کو کیسے تخلیق کیا ! دراصل بات یہ ہے کہ خواب اپنی فنی روایت کی تنگ دامانی کے شکوہ سنج تھے۔ انہیں اپنے بیان کے لئے کچھ اور دستیں درکار تھیں اور ان کے جذبات پرچیدہ، خیالات وسیع اور افکار ہم گیر تھے۔ اس لئے ان کے تجربات کی تردد و تکینیت نے انہیں غیر شعوری طور پر ان علامتوں اور اشاروں کی طرف راغب کیا۔ چنانچہ ان کا ہر تجربہ کسی نہ کسی علامت یا اشارے کی سمت میں اپنے آپ کو روٹا کرتا ہے۔ کہیں یہ علامتیں اور اشارے بہت واضح اور نمایاں نظر آتے ہیں۔ کہیں ایک نقاب پوشی کے عالم میں انہیں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس عالم میں ان کے من میں کچھ زیادہ ہی نکھار کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ کچھ زیادہ ہی جاذبِ نظر دکھائی دیتا ہے۔

خواب کی شاعری ان علامتوں اور اشاروں کا اجماع خاما ٹھار خانہ ہے۔ اس ٹھار خانے میں ان کے تخیل کی رنگین کاریوں نے نئے نئے رنگ بکھرے ہیں اور نوڑ کے طوفان اٹھائے ہیں چنانچہ مجموعی طور پر علامتوں اور اشاروں کے اس ٹھار خانے میں وہ من پیدا ہو گیا ہے جو ہر یک وقت رنگیں اور پُر کار بھی ہے اور سادہ اور پلور دار بھی !

رُزِیْجے اور پھائیے

غالبیے علامتوں اور اشاروں کے شاعر ہیں اور ان کی اس
 علامت پسندی نے بعض دوسرے عوامل کے ساتھ مل کر ان کی شاعری
 میں رمزیت، ایبائیت اور اجہام کے مہلانات بھی پیدا کئے ہیں۔
 علامت پسندی کے ساتھ جن عوامل نے ان کی شاعری میں رمزیت
 ایبائیت اور اجہام کے مہلانات کو پیدا کیا ہے ان میں غالب
 کے احساس کی شدت، فکر کی جہدی، خیالات کی پیچیدگی، تقریبات
 کی گہرائی اور جمالیاتی انداز کے نئے سیار اور فن کی نئی اقدار
 بھی برابر کے شریک ہیں۔ غالب رمزیت، ایبائیت اور اجہام
 کے ذریعے گہرے سے گہرے اور پیچیدہ سے پیچیدہ خیالات کو
 فن کے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ اس لئے رمزیت اور ایبائیت
 ان کے فن میں خوب ہے، مقصد نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ سرخ

اور مراد کے ساتھ ان پہلوؤں کا باہمی رابطہ اور رشتہ ان میں محنت کی اقدار کو پیدا کر دیتا ہے اور احساسِ جمال کی تکیں کا باعث بنتا ہے۔

رمزیت اور ایماہیت یوں تو ہر فن کی بنیاد ہے لیکن شاعری اور خاص طور پر غزل کے فن میں اس کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس کا بنیادی سبب تو یہی ہے کہ غزل ایک محدود صنف ہے۔ اس کا کینوس بہت چھوٹا ہے لیکن اس کے باوجود وہ گہرے سے گہرے افکار و خیالات اور پیچیدہ سے پیچیدہ جذباتی تجربات کو اپنے دامن میں جگہ دیتی ہے۔ اس لئے اس کو مجبوراً رمزیت اور ایماہیت کا سارا پنا پڑتا ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ غزل غنائی شاعری کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور غدیہ داخلیت پسندی اس کی بنیاد ہے۔ اس شدید داخلیت پسندی کی وجہ سے اقدار اس میں کھل کر اور واضح طور پر نہیں ہو سکتا۔ غزل کے شاعر ہر دور میں رمزدایا کے پردے میں اقدار و افلاخ کرتے رہے ہیں اور انہوں نے اس رمزدایا کو غزل کے مزاج کا جز بنا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کے فن کے ساتھ رمزدایا اور رمزدایا کے ساتھ غزل کے فن کا خیال آتا ہے۔

غالب نے اپنے فن میں رمزدایا کے اس درجہ کو کچھ اور بھی آگے بڑھایا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ غزل کے صحیح مزاج میں تھے۔ اور اس کے فنی اصولوں کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ انہیں اس حقیقت کا علم تھا کہ غزل صرف رمزیت اور

ایمانیت ہی کے سہارے اپنے دامن میں دستیں پیدا کر سکتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے رمزیت اور ایمانیت سے کام لے کر اس صنف میں یہ دستیں پیدا کیں۔ غالب کے فلسفیانہ سیلان طبع اور اجتماعی شور نے انہیں اس کام کی طرف کچھ زیادہ ہی آمادہ کیا۔ فارسی اور اردو غزل کی روایت میں نقوت نے رمزیت اور ایمانیت کو پیدا کرنے کے سلسلے میں جو کارنامے نمایاں انجام دیئے تھے، ان کو انہوں نے اپنے لئے شیخِ راہ بنایا۔ چنانچہ انہوں نے مسائل نقوت کو رمز و ایما کے پردے میں بیان کیا۔ اور مسائل نقوت سے بے ہونے حیات و کائنات کے مساوات کی فلسفیانہ تاویل بھی رمز و ایما کے پیرائے میں کی۔ اجتماعی شور سے کام لے کر انہوں نے سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی مساوات و مسائل کے مومنوعات کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی اور انفرادی رنگ کے پردے میں اجتماعی تجربات کی ترجمانی کی۔ ان حالات کی وجہ سے رمزیت اور ایمانیت کا رنگ آن کی شاعری میں کچھ زیادہ ہی گہرا ہو گیا، اور اس نے ان کے فنی میں ایک مستقل حیثیت اختیار کر لی۔ چنانچہ غالب کے کلام میں شروع سے آخر تک اس رمز و ایما کی ایک لہری دوڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ مرن چند اشار ان کے اس فنی سیلان کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہیں۔

فنپر چہر لگا کھینے آج ہم نے اپنا دل
خون کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

ہوتے گل، نانا دل، دودھ چراغ، صحن
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

ہوائے سیر گل آئینہ ہے مہرئی تامل
کو اندازِ بھون غلطیوں پہل پسند آیا

پھر رے کوچے کو جانا ہے خیال
دل گم گشتہ سگر یا د آیا

تو اور آرائشِ خم کا نکل !
میں اور اندیشہ ہائے دور وراز

تو لگے نہ کہیں آن کے دست و ہاز کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

دے کے خط سزا دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

اُن کے دیکھے سے جزا جاتی ہے مُنہ پر رونق
وہ کہتے ہیں کہ بھار کا نال اچھا ہے

چمکے چمکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے مگر
جنس کے کرتا ہے بیان شرمی گفتارِ دوست

عاشقی مبر طلب اور تنہا ہے تاب
دل کا کیا رنگ کروں غنِ بگر ہونے تک

راہِ مشق نہ رسوا ہو سب نے
ورنہ نہ مر جانے سے کچھ جمید نہیں

تماشا کر اے مجھ آئینہ داری
تجھے کس تنہا سے ہم دیکھتے ہیں

تہا کے آتے آتے خطا اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مئے عشرت کی خواہش ساقی گروں سے کب کھجے
یہ جیسا ہے اک دو چار جامِ دھڑکوں وہ بھی

ہمدی سادگی حقِ اقصاں ناز پر مرزا
را آنا نہ تھا ظالم مگر متید جانے کی

علا کہ ہے یہ بلی خار اسے لاد رنگ
خانہ کو میرے غیشے پرے کا لگان ہے

عمر ہر چند کہ ہے برقِ خدram
دل کے غول کرنے کی فرصت ہی ہی

گرچہ ہے طرزِ تاملِ پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

اف اشار میں مختلف طریقوں سے رمز و ایما کی کیفیت کو
پیدا کیا گیا ہے۔ کہیں ان میں علامتیں استعمال کی گئی ہیں۔ کہیں
اشعاروں سے کام لیا گیا ہے۔ کہیں مومنوع کے بعض حصے چھوڑ
دیئے گئے ہیں۔ کہیں خیال کو ادھورا دکھایا گیا ہے۔ کہیں ایسی
صورت پیدا کی گئی ہے کہ پڑھنے والے کا حقیقی معنی ایسی چیزوں
کو پورا کرے جن کو جان کر چھوڑ دیا گیا ہے۔ کہیں معنوں کے
معنی ہموار کو چھپانے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ پڑھنے والے
کے لئے تجسس کی فضا پیدا ہو۔ غرض غالب نے اپنے بیشتر
اشار میں جو رمزیت اور ایمایت پیدا کی ہے اس میں ایک باتامہ

نظام تھا ہے اور اس نظام کی تہ میں نفسیات اور مہیاتی عوامل کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ غالب نے اس طرح رمزیت اور ایمائیت کو انسانی فطرت سے ہم آہنگ کیا ہے اور اس میں حُسن و جمال کی ایسی اقدار پیدا کر دی ہیں جن کو انسان فطری طور پر اپنے احساس جمال کی نیکیوں کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔ غالب کی رمزیت اور ایمائیت حیرت اور تجسس کے تاروں کو چھیڑتی ہے اور پڑھنے والے میں غیر شعوری طور پر خود اعتمادی کا احساس پیدا کر کے کچھ حاصل کرنے کے جذبے کو بھی بیدار کرتی ہے۔

غالب نے اپنے فن میں اس رمزیت اور ایمائیت سے بڑی پلودار کیفیت پیدا کر دی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس میں پہلی سی چمک رہی ہے، تتلیاں سی اڑ رہی ہیں اور جگنو سے جگمگا رہے ہیں۔

دفن تمام چیزوں کے حُسن کی طرح غالب کے فن کی رمزیت اور ایمائیت کے حُسن کو بھی مرث محسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔ اس میں گشتہ نہیں کہ رمز و ایما کے حُسن کو پیدا کرنے میں غالب اپنا جواب نہیں دیکھتے۔ انہوں نے اس معاملے میں بڑی چابک دستی کا ثبوت دیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض مقامات ان کے فن میں ایسے بھی آتے ہیں جہاں توازن کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔ اور ان کی رمزیت اور ایمائیت پیچیدہ اور دوراز کار ہو کر ایسا

کی سرحدوں میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس عالم میں اس کا سمجھنا ناممکن نہیں ہوتا۔ بعض لوگوں نے اس کو غائب کے فن کا عیب بنایا ہے لیکن بعضوں نے اس کو ان کے فن کی نمایاں ترین خصوصیت قرار دے کر اس کو سراہنے کی کوشش کی ہے۔

غائب کے فن میں ابہام کا میدان بہت واضح ہے لیکن اس میدان کو غائب کی شاعری کا عیب نہیں سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ ابہام کا میدان بعض خاص حالات کی وجہ سے ان کے فن میں پیدا ہوا ہے۔ اگر ان حالات کو سامنے رکھا جائے اور اس ابہام کے محرکات کا مزاج بن جائے تو اس میں حسن کے بعض پہلو بھی نظر آنے لگتے ہیں اور وہ ان کے فن اور جابجائی انہار کا ایک اہم حصہ معلوم ہونے لگتا ہے۔

اس ابہام کے میدان کو پیدا کرنے میں غائب کی مخصوص افکار، جسے ان کا مخصوص مزاج، ان کی مخصوص شخصیت، اس شخصیت پر مبنی اہم شخصیتوں کے اثرات، ان کا مخصوص ماحول اور مخصوص حالات، ان کے مخصوص افکار و خیالات، اور ان کے مخصوص فنی نظریات کا بڑا ہمتہ ہے۔ آفتاب طبع اور طبیعت کے اعتبار سے غائب مشکل پسند تھے۔ ان کے مزاج میں تن آسانی اور سہل لکھائی نہیں تھی۔ وہ تھک کر بیٹھنا نہیں جانتے تھے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہنے میں انہیں ملال تھا۔ ان کی شخصیت نہایت چلوں و رفتی۔ اور وہ ہر بات میں چلوں کا سہتے اور ہر چیز میں چلوں پیدا کرتے تھے۔ ان پر ندری کے بعض مشکل پسند شاعروں کا

اثر بہت گہرا تھا۔ خاص طور پر بیپل سے وہ بہت متاثر تھے۔ ان کے ماحول میں بھی مشکل پسندی کا دورہ دورہ تھا۔ سیاسی ماسٹرٹی اور تہذیبی انحطاط و زوال نے ہر شخص کو کسی نہ کسی اعتبار سے مشکل پسند موزوں بنا دیا تھا۔ اس مشکل پسندی سے درحقیقت وہ اس غلام کو پتہ کر رہے تھے جو انحطاط و زوال کے باوجود اس زمانے میں بعض ذہنی اور فکری سرزیکوں کی وجہ سے زندگی کے ہنار بھی موجود تھے۔ فکر کی گہرائی اور خیال کی رشت ماحول میں عام تھی۔ چنانچہ لوگ ہندی سے بات کرنا اور سننا پسند کرتے تھے۔ ان حالات نے فن کے میاروں میں بھی انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ اب حرف سادگی اور صفائی ہی فن کا میار نہیں تھی، ستر داری کی کیفیت کے ساتھ ایک پیچ دار انداز بھی فن کا میار بن گیا تھا۔

یہ حالات تھے جن کی وجہ سے غاب کے فن میں ابہام کا میلان پیدا ہوا۔ اس میں ان کی کوئی شعوری کوشش شامل نہیں تھی۔ اس میلان کو تو ان کے فن میں پیدا ہونا ہی چاہئے تھا۔ بات یہ ہے کہ وہ ایک رومانی مزاج فن کار تھے۔ رومانی فکر کی بنیاد تحقیق کی بلند پروازی ہوتی ہے۔ اس تحقیق کے سہارے وہ ایسے مقامات تک پہنچتا ہے جہاں ہر شخص کا پہنچنا آسان نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ اس کے فن کی بنیاد کو جھڑ نہیں سکتے۔ وہ بعض اوقات عام لوگوں کے لئے الجھنی ہو جاتا ہے اور وہ اس کے ساتھ دوسری خیال کو مستانے نہیں

کر پاتے۔ ابہام کا تصور ایسے ہی مواقع پر رونما ہوتا ہے۔
 ہربرٹ ریڈ نے صحیح لکھا ہے کہ ابہام شاعر کے یہاں نہیں ہوتا
 خود پڑھنے والوں کے ذہنوں میں ہوتا ہے۔ جب وہ شاعر کے
 پرچمیدہ تجربات کی تہ تک نہیں پہنچ پاتے اور اس کی پرواز کا
 ساتھ نہیں دے سکتے تو اس کے کام کو مبہم تصور کر لیتے ہیں۔

ویسے ابہام شاعری کے لیے ہر ذات خود بھی کوئی انہنی اور
 نامازس چیز نہیں ہے۔ ارسطو کے زمانے سے لے کر اس وقت
 تک شاعری کے نقادوں نے کسی نہ کسی زاویے سے شاعری میں
 ابہام کی اہمیت اور ضرورت کو تسلیم کیا ہے۔ ولیم ایپسن نے
 اپنی کتاب (SEVEN TYPES OF AMBIGUITIES)

میں لکھا ہے کہ ابہام شاعری کے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے۔
 وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کو شاعری کے لئے
 ناخوشگوار اور نامرزا بھی نہیں کہنا چاہئے۔ اس خیال میں
 بڑی صداقت ہے کیونکہ شاعری کے بے شمار پہلو ایسے ہیں جن
 کی وضاحت نہیں کی جا سکتی۔ خاص طور پر اس کا محض بہت
 بہتر درجہ ہوتا ہے۔ اس کو تو صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔

پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ شاعری مسنوی اعتبار سے بڑی
 ہتوکار چیز ہے۔ ایک معمولی سے شعر میں بھی کئی معنی ہوتے

ہیں۔ آئی۔ اے۔ رچرڈز نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ کسی
 نظم یا شعر میں مسنی کے چار پہلوؤں کو دیکھنا چاہئے۔ یعنی اس
 میں کیا محسوس کیا گیا ہے؟ شاعر کے شعر کی کیا کیفیت ہے؟ اس

کی تر میں بنیادی مقصد کیا ہے اور شاعر کا اپنے پڑھنے والے کی طرف روتہ کیا ہے ؟ ظاہر ہے کہ اس طرح شاعری کے مصنوعی پہلو کو دیکھا جائے تو وہ خامی پیچیدہ چیز ہو جاتی ہے ۔ اسی لئے اس میں ابہام کا احساس ہوتا ہے ۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ شاعری کی مصنوعیت بڑی متنوع وسیع اور ہم گیر ہوتی ہے ۔ اسی لئے فی ثلثی نے اس خیال کا انکار کیا ہے کہ جو چیز بھی ہم گیر ہوتی ہے وہ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ چھپانے کی کوشش کرتی ہے ۔ شاعری پر یہ بات صادق آتی ہے ۔ وہ بھی ایک ہم گیر چیز ہے ۔ اس لئے اس میں بہت سی باتوں کو چھپا کر پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ۔ اسی لئے ابہام اس کا لازمی جز بن جاتا ہے ۔

غالب کی شاعری میں جو ابہام ہے اس میں بھی یہی صورت نظر آتی ہے ۔ تر دور تر مصنوعیت اس کی بنیاد ہے ۔ اس کی تیر و تھکیں پیچیدہ جذبات ، حساسات ، گہرے افکار و خیالات اور جاپاتی انکار کے پہلو دار انداز کے اہتوں ہوتے ہیں ۔ یہ اشارہ دیکھئے ۔

سرنی تیر میں سُخڑ ہے اک سورت خوابی کی
بیودہ برقی خرمن کا ہے خون گرم دہقان کا

خزنی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چرخِ مُردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

کچھ نہ کی اپنے جڑیں نارسانے دریاں
ذرتہ ذرتہ روکش خورشید عالم تاب ستا

دل شک سے ٹپکتا وہ ہو کہ پیرۂ عشقا
چمے غم کچھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

جھائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی
دوام کفایت خاطر ہے عیش و نیا کا

رہبر یک شیرازۂ وحشت ہیں اجڑانے بہر
سبزہ بیگانہ ، صبا آوارہ ، گل نا آشنا

مغنیں برہم کرے ہے گنجۂ بازِ خیال
ہیں دق گرانی نیرنگ یک بت خانہ ہم

رونی ہستی ہے عشق خانہ و یل ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمی میں نہیں

نزدائے غم کو ہی اسے دل نصیبت جائیے
بے صدا ہو جائے گا یہ ساز ہستی ایک دن

مانع دشت نوروی کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

ہے شعلِ نورِ سور پر ہر دھو دھبہ
یہاں کیا دھرا ہے قلوۃ و موج و جاب میں
ہے غیبِ غیب ہی کو سمجھتے ہیں ہم شہود
پیشِ تلوار ہے آئینہ وائمِ نقاب میں

ہیں زوالِ آمادہ احسنِ آفرینش کے تمام
مہر گردوں ہے چراغِ رہ گزائر با دیاں

نشہِ رنگ سے ہے دامنِ گل
مست کب بندِ قتب باندھتے ہیں
اہلِ تدبیر کی داماندگسٹیاں
آہوں پر بھی حفا باندھتے ہیں

ہے آدمی بھانے خود اک مشرِ خیاں
ہم انجمنِ کجے ہیں خلوت ہی کیوں زہر

غمِ دنیا سے گر پائی بھی زمرست سرٹھانے کی
فلک کا دیکھنا تھریبِ ترے پاؤں کی

کھلے ٹاکس طرح معنوں مرے مکتوب کا یا رب
متم کمال ہے اس کا زرنے کا فز کے چلانے کی

ہے دہی بدستی ہر ذرہ کا خود مُذَر خواہ
جس کے جلوسے سے زمیں تا آسماں سرخند ہے

کارگاہِ نہتہ میں لالہ داغ سا ماں ہے
برقِ خوشیِ راحتِ خونِ غم و بہقان ہے

تھنہ تاشگفتی با بَربکِ عافیت معلوم
بادِ جود و مہربانیِ خوابِ گل پریشان ہے

برچند ہر اک شے میں تو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے
طراوتِ چمن و خوانِ ادا کہتے

دستِ میں شے نہیں کہ ان اشار میں ابہام ہے۔ یہ نہایت
صاف اور سادہ نہیں ہیں۔ ان کی مصنوعیت پیچیدہ اور پہلو دار
ہے۔ غالب کے شاعرین نے اس قسم کے اشار پر خوب خوب

نامہ فرسانی کی ہے اور ان سب کی شرح کو سامنے دکھا جاتے
تو ان اشارے کے معنوم کی تہہ تک پہنچنا شاید اور بھی مشکل ہو۔
لیکن جو کچھ ان لوگوں نے لکھا ہے اس سے کم از کم اتنا اذکار
مزدور ہو جاتا ہے کہ غالب معنوی اعتبار سے ایسے متوزع اور
پہلو دار اشارے بھی کہہ سکتے تھے۔ ان میں ابہام نہیں ہے۔
ابہام کا حصہ ہے اور یہی ان کا فنی کارنامہ ہے۔

غالب نے اس ابہام کو ایک اسلوب بنا دیا ہے۔ اس
کوفی کی صورت دے دی ہے اور اس فنی کو عجائباتی اعتبار سے
انتہائی مہذبوں پر پہنچا دیا ہے۔ انہیں خود بھی اس حقیقت کا
شدید احساس ہے۔ جب ہی تو انہوں نے اپنے اس اسلوب اور
فنی کے بارے میں اس قسم کے اشارے کیے ہیں۔

نہ تالشش کی تنہا ہے نہ حصے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشد میں سنی نہ ہی

مشکل ہے زبیں کلام میرا سے دل
میں سے کے اے سخن دران کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل و گر نہ گویم مشکل

ہمارے خراجی اب حرف دل لگی کے اسد
کھلا کر غامد حوض ہنر میں خاک نہیں

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے سنی کی میں
روح القدس اگرچہ مرا ہم زبان نہیں

آگنی دامن شیدان جس قدر چاہے بھائے
کد عافتا ہے اپنے عالم تقریر کا

ہوں گرمی نشاۃِ ثانی سے نرس سخی
میں مذہب گمشدہ تا آفریدہ ہوں

ان اشعار میں غائب کا یہ کہنا کہ انہیں نہ شائش کی تنہا ہے نہ
صلے کی پروا۔ اگر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے اشعار میں معنی نہیں
ہیں تو وہ اس کی پروا نہیں کرتے۔ ان کا کلام مشکل ہے۔ بڑے
بڑے سمجھنے والے اس کو سن کر آسان کہنے کی فرمائش کرتے
ہیں۔ ان کے لئے بڑی مشکل ہے۔ کہیں تب مشکل نہ کہیں تب
مشکل۔ ان کے اشعار تو اب حرف دل لگی کے لئے رو گئے ہیں
اب ان پر یہ بات ردِ سخن ہوتی ہے کہ ان کا کوئی کہنے والا
نہیں۔ اس لئے حوض ہنر بے کار ہے۔ وہ تو اپنے سنی کی داد
روح القدس سے پاتے ہیں حالانکہ وہ بھی ان کا ہم زبان نہیں

ہے۔ عقل خواہ کتنے ہی دمام بچائے لیکن ان کے خیال کو اس پر نہیں کر سکتی۔ ان کے عالم تقریر کا مدعا تو حقا ہے۔ وہ تو گری نشاۃ عقد سے نرسج ہیں اور ان کی حیثیت تو ایک مذہب گشت ناآزیدہ کی ہے۔ اس حقیقت کو صاف ظاہر کرتا ہے کہ انہیں اپنے فن کے مہم ہونے پر ناز تھا اور وہ اس کو اپنی وسیع، ہر گیر کو تہ در تہ رمزیت کے اظہار و ابلاغ کے لیے مستحق اور فردی خیال کرتے تھے۔

اور یہ ابہام بھی درحقیقت اس رمزیت اور ایمائیت ہی کا ایک اور روپ تھا جس کو ہایاتی اظہار اور فن کے لئے ہر دور میں مزدی قرار دیا گیا ہے۔

تصویر کاغذ (دوبلی تراش)

غالب کی شاعری میں اُن کی تصویر کاری اور پیکر تراشی یا ایجری
 ہی خصوصیت کے ساتھ اہمیت رکھتی ہے۔ اُن کا کلام ان تصویروں اور
 پیکروں کا ایک نگارخانہ ہے۔ ان تصویروں کے دھنگ بڑے گہرے اور
 شوخ ہیں۔ ان کے نقوش بڑے ہی ٹیکے اور پہلو دار ہیں۔ یہ
 تصویریں سیدھی، سادی اور سہل نہیں ہیں۔ ان میں تو ایک طرح
 کا آجہار پایا جاتا ہے اور یہ آجہار زندگی اور جوانی کی نشانی ہے۔
 یہ تصویریں چلتی چرتی، حرکت کرتی اور بولتی نظر آتی ہیں۔ غالب کا
 کمال یہ ہے کہ انہوں نے ان بے جان تصویروں میں جان ڈال دی
 ہے اور ان تصویروں کا کمال یہ ہے کہ وہ صرف نظر ہی کے لئے
 دل کشی کا سامان فراہم نہیں کرتیں۔ انسان کے تمام احساس کو متاثر کرنا
 ان کا شعار ہے۔

شاعری میں تصویروں اور پیکروں کو بڑی اہمیت حاصل ہے ۔
 بعض نقادوں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ شاعری صرف ان تصویروں
 اور پیکروں کے مجموعے کا نام ہے جن کو الفاظ کے لباس میں ناپل
 کیا جاتا ہے ۔ یہ بات شاید پوری طرح صحیح نہ ہو کیونکہ شاعری
 صرف تصویروں اور پیکروں ہی کا نام نہیں ہے ۔ ان کے علاوہ بھی
 بہت کچھ ہے ۔ اہمیت ان کے بغیر شاعری میں وہ بات پیدا نہیں
 ہو سکتی جس کی اس سے توقع کی جاتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ارسطو کے
 زمانے سے لے کر اس وقت تک شاعری کے مزاج داں ان
 تصویروں اور پیکروں کی اہمیت کے قائل رہے ہیں ۔ اور اپنی
 اپنی تنقیدی اصطلاحوں میں انہوں نے اپنے اپنے مخصوص انداز
 میں ان کی اہمیت کو واضح کیا ہے ۔ ان کی باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا
 ہے کہ شاعری ان تصویروں اور پیکروں کے سہارے زندگی سے
 زیادہ بھرپور ہو جاتی ہے اور ساتھ ہی اس میں جاہلیاتی اعتبار سے
 رنگینی اور رعنائی کے چلو بھی پیدا ہو جاتے ہیں ۔

بات درحقیقت یہ ہے کہ شاعری میں تصویروں اور پیکروں
 کا وجود اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ شاعر کی گرفت اپنے موضوع
 پر بہت مضبوط ہے ۔ اور جس چیز کو وہ پیش کرنا چاہتا ہے اس
 نے اس کی شخصیت کا جڑ بن کر ایک گہرائی کی تجربے کی صحت اختیار
 کی ہے اور اسی تجربے کے زیر اثر اس کے جاہلیاتی انہار نے
 مختلف تصویروں اور پیکروں کا روپ اختیار کر لیا ہے ۔ چنانچہ
 شاعر کے داستانے ہوتے یہ پیکر اس کے فنی کو مؤثر بنانے میں

نمایاں کام کرتے ہیں۔ ان کا اثر پڑھنے والے یا سننے والے کے حواس پر ہوتا ہے اور وہ ان حواس کے تاروں کو چھیڑ کر ایک ایسی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے وہ ایک عالم سرخوشی میں پہنچ جاتا ہے۔ اور یہی شاعری اور شاعرانہ فن کاری کی سراج ہے۔

ایک بند پایہ شاعر انہیں پکیروں اور تصویروں سے پہچنا جاتا ہے اور اس کے شاعرانہ فن کی اندازہ دانی اسی پیمانے سے کی جاتی ہے کہ اس نے کتنی جان دار، مؤثر اور دلکاویز تصویریں اور پکیروں کی تخلیق کی ہے۔ (افزا پاؤنڈ نے لکھا ہے کہ ایک مسیح تصویر اور پیکر وہ ہے جو ایک لمحے میں شاعر کے جذباتی اور ذہنی تجربے کو پیش کرے۔ اسی صحت میں ان تصویروں اور پکیروں میں جان پڑ سکتی ہے، ورنہ تصویریں اور پکیروں کا پیش کرنا تو کوئی ایسی مشکل بات نہیں ہے۔ ہر بات ایک تصویر کو سامنے لا کر کھڑا کر سکتے ہیں اور ہر خیال ایک پیکر کو نمایاں کر سکتا ہے۔ پاؤنڈ نے اسی وجہ سے یہ لکھا ہے کہ شاعر اگر اپنی زندگی میں صرف ایک تصویر بناتے اور ایک پیکر تراشے تو اس کے لئے کافی ہے کیونکہ بے شمار بے جان پکیروں کا تراشنا اور تصویروں کا بنانا شاعر کے لئے کوئی قابلِ تعریف بات نہیں۔

شاعری میں تصویروں اور پکیروں کے اثر کا دائرہ محدود نہیں ہوتا۔ وہ تو پھیل کر بکراں ہو جاتا ہے کیونکہ وہ صرف مشاہدے ہی سے رشتہ نہیں جوڑتے بلکہ محسوسات سے تعلق

پیدا کرتے ہیں۔ اسی لئے ان کا میدان بہت وسیع ہو جاتا ہے۔
 ہر ایک بات یہ بھی ہے کہ ان تصویروں اور پیکروں کی حیثیت
 علامتی بھی ہوتی ہے۔ اور وہ اپنے اثر سے بے شمار دوسری
 تصویروں کو جناتے اور پیکروں کو تراشتے ہیں اور اس طرح شاعری
 میں تصویروں اور پیکروں کا ایک مرتبہ سا تیار ہو جاتا ہے۔ بلکہ
 یہ کتنا زیادہ صحیح ہے کہ ایک نگار خانہ سا بن جاتا ہے۔

کورج نے اپنی تحریروں میں ان تصویروں اور پیکروں کی
 اہمیت کی وضاحت کی ہے اور شاعری کے فن میں ان کے مرتبے
 کو متبہ کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ تصویریں بذات خود
 چاہے کتنی ہی حسین اور دلکش ہوں لیکن اس وقت تک مؤثر نہیں
 ہو سکتیں جب تک ان کے پیچھے شاعر کی ذہانت و فطانت اور اس
 کی کسی خاص کیفیت اور جذبے کا اثر نہ ہو۔ اور اس سے
 کورج کا مطلب یہ ہے کہ شاعری میں جو تصویریں بھی پیش کی جائیں
 اور جو پیکر بھی تراشے جائیں، ان میں شاعر کی شخصیت اور اس
 کے تجربے کا اثر ضرور ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس سے ان میں زندگی
 پیدا ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے ان تصویروں اور پیکروں کے
 علاوہ دوسری اُن گنت ایسی تصویروں اور پیکروں کی تخلیق ہوتی
 ہے جو کسی نہ کسی طرح شاعر کے شاعرانہ تجربے سے
 ہوتا ہے۔

غالب نے اپنی شاعری میں جو تصویریں بنائی ہیں اور جو
 پیکر تراشے ہیں، ان میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جن کا

ذکر آدھر ہوا ہے۔ غالب کی شاعری تصویروں اور پیکروں کا مرقع بکر
 ٹکٹاؤ ہے۔ انہوں نے اردو شاعری کی مروجہ تصویروں اور پیکروں
 کو بھی اپنے شاعرانہ تجربات کے اظہار کے لئے استعمال کیا ہے۔
 اور ان تجربات کی دستِ تنوع اور ہمہ گیری کے پیش نظر بے شمار
 نئی تصویروں کو بنایا اور نئے پیکروں کو تراشا ہے۔ ان کے لئے
 موادِ انہوں نے اپنی تدریج و تہذیب اور مخصوص حالات کے زیر
 اثر تشکیل پانے والی اپنی مخصوص ذہنی کیفیت سے حاصل کیا
 ہے۔ یہ تصویریں اور پیکر جو غالب کی شاعری میں ملتے ہیں، وہ
 ان کے سیاسی، معاشرتی، تہذیبی حالات، اپنی سماعت اور آن
 کے زیر اثر پرورش پانے والی ذہنی کیفیات کا آئینہ ہیں۔

یہ بات اس سے قبل بھی کہی جا چکی ہے کہ غالب ایک تہذیب
 کی پیداوار اور ایک تہذیبی روایت کے علم بردار ہیں۔ ان کی
 شخصیت پر اس تہذیب اور تہذیبی روایت کی گہری چھاپ نظر
 آتی ہے۔ غالب کا زمانہ اگرچہ اس تہذیب اور تہذیبی روایت کے
 انحطاط و زوال کا زمانہ ہے لیکن اس کے باوجود یہ تہذیبی روایت
 غالب کے زمانے میں اپنے شباب پر نظر آتی ہے۔ اس زمانے
 میں انحطاط و زوال کی کیفیت نے ایک عظمت کا احساس بھی افزا
 ہیں بڑھا دیا تھا۔ غالب کے بیان میں اس کا احساس شدید ہے۔
 اور وہ صحیح معنوں میں احساسِ عظمت کے اس گرجان کی نائندگی
 کرتے ہیں جو اس زمانے کے افراد میں موجود تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ
 ترکی اور ایرانی تہذیبوں کی گہری ہوتی صورت تھی جس نے اس

برغلم میں ہندوستانی تہذیب کے ساتھ مل کر ایک نہایت ہی
ترستی ہوئی صورت اختیار کر لی تھی۔ غالب نے اسی تہذیب کی
گود میں آنکھ کھولی اور اسی کے سائے میں اُن کی نشوونما ہوئی۔
انہوں نے اسی تہذیب اور تہذیبی روایت کو اپنی دنیا بجا، اور
اس کی ایک ایک چیز کو اپنے سینے سے لگانے کی کوشش کی۔
یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت اور شاعری دونوں میں اس تہذیب
اور تہذیبی روایت کے اثرات اتنے گہرے نظر آتے ہیں۔

غالب کی امیجری، تصویرکاری اور پیکر تراشی میں بھی اس
تہذیبی روایت کا اثر مختلف زاویوں سے اپنے آپ کو رونما کرتا ہے
مثلاً اس تہذیبی روایت کی بنیادی خصوصیات یہ تھیں کہ انداز
مظہر سہا تے تھے، ہزم ہائے عیش و نشاط کو آہستہ کرتے تھے۔
سے دنیا کی باتیں کرتے تھے۔ جام چھلکاتے تھے اور مست ہو
جاتے تھے۔ غالب کی شاعری میں یہ تصویریں اور پیکر بہت نمایاں
نظر آتے ہیں۔ یہ اشارہ دیکھئے۔

دل گذر گاہِ خیال سے دساعز ہی ہوی
گر نفسِ ہادۂ سر منزلِ تقدی نہ ہوا

بقدر عرف ہے ساقی تہارتشہ کامی بھی
جو تہ دہائے ہے تو میں خیالہ ہوں ساحل کا

قلوۃ سے بس کو حیرت سے نفس پر دہرا
خطِ جام سے سراسر رشتہ گوہر ہوا

میں اور بزم سے سے یوں تشنگام آؤں
گر میں نے کی سخی تو رہ ساقی کو کب ہوا

بے نئے کسے ہے طاقت آشوب آگئی
کیونہا ہے جز حوصلہ نے خطِ ایاض کا

ہم سے کھل جاؤ بہ وقت سے پستی ایک دن
دہن ہم چھڑی گئے دکھ کر غمِ سستی ایک دن
قرن کی پتے تھے سے لیکن بھتے تھے کہ ہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ سستی ایک دن

غالب چمن شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیا ہوں روزِ ابد و شبِ استیاب میں

جہاں فرا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گو بارگِ جاں ہر گیش

جب سیکڑہ تھتا تو چسرا ب کیا بک کی قید
سہد ہو مدرسہ ہو ، کوئی منافعت ہو

مے سے غزن نشا ہے کس رو سیاہ کو
اک گونہ بے خودی بچے دن رات چاہئے

نئے عشرت کی خواہش ساقی گردوں سے کیا کیجئے
نئے میٹھا ہے اک دو چار جام واذ گویا وہ بھی

رندیاں در سے کدہ گستاخ ہیں ز اہد
ز سار نہ ہونا طرفت ان بے ادبوں کے

جا داو بادہ نوشی رندیاں ہے شش صحبت
خافق گماں کرے ہے کہ گیتی خسراب ہے

شب کہ وہ مجلس فروز خدمت ناموس تھا
رشتہ ہر شمع خاک پرست غار س تھا

یاد تھیں ہم کو بھی رنگ رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگار عاق نسیاں ہو گئیں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے میرے سخی
تو کے ستمِ ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

اس بزم میں مجھے نہیں بُنیٰ حیا کیجئے
بیٹا رہا اگر سپہِ اشار سے ہوا کیجئے

اُس کی بزمِ اُراتیاں سُن کر دلِ رنجِ وِیاں
شکلِ نقشِ بدعاتے خیرِ میثا سبائے ہے

گرچہ ہے کس کس برائی سے دُلعے با ایں ہر
ذکرِ میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس مغل میں ہے

اے تازہ وارِ دِلِ بیاہِ ہوائے دل
زَنہار اگر تھیں ہو کسِ نازِ کوشش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عسرتِ نگاہ ہو
میری سوزِ کوششِ نصیحتِ نبوت ہے

ساقِ بہلولہ و ششِ ایمان و آگہی !
مکروب بہ نغمہ بہزنِ تلکیں و ہوش ہے

یادِ ب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط
 طمان باغبان و کونِ گلِ فروزش ہے

لعلِ خرامِ ساقی و ذوقِ مدائے چنگ
 پر جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گلش ہے

واغِ ذاقِ صحبتِ شب کی حُبلِ ہون
 اک شمع رہ گئی ہے سودہ ہی غرض ہے

ہیوں شراب اگر خم بھی دیکھوں دو چار
 یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے

ہے ہوا میں سحراب کی تاثیر
 بادِ نوشی ہے بادِ پیمائی

گردِ خوشِ ساغرِ صدِ جلوۂ رنگیں تج سے
 آئینہ داری یک دیدِ جہراں تج سے

پلا مے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
 پیالہ گر نہیں دیتا ز دے شراب تو جسے

وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کیوں پھر کہ غافل تھے
 شکیب و صبر اہل انجمن کی آزمائش ہے

کہتے ہوئے ساقی سے میا آتی ہے ورنہ
 جے یوں کہ مجھے دردِ سترِ جام بہت ہے

انے اشعار میں سے وساعز، قنور، سے، جام، سے، مے پرستی، بادہ
 جام، سے کدہ، بے خودی، رندان، دردِ میکدہ، بادہ نوشی، رندان،
 ہوس ناؤ، کوشش، تکلف خوام ساقی، تم، شیشہ، قدح، کدہ، سہو
 گردش، سافر صد جلو، رنگیں، پیار، شراب، دردِ ستر جام، مجلس رنگ
 بزم آرائیاں، بزم ناز، فصلِ طرب، دامن باغباں، کتب گل
 فروش اور شیخ وغیرہ کی جو تصویریں بنائی ہیں اور جو پیکر تراشے گئے
 ہیں، ان کا تعلق ایک تہذیب اور تہذیبی روایت سے ہے۔ لیکن غالب
 نے ان سب میں اپنے تجربات کا اس طرح دوڑایا ہے کہ یہ
 تصویریں اور پیکر منہوی اور نعتی دونوں اعتبار سے مدد و نظر نہیں
 آتے۔ برخلاف اس کے ان کے انفرادی تجربات نے ان میں وسعتیں
 پیدا کر دی ہیں۔ اور ان کے ساتھ اس تہذیب، معاشرت اور اس
 کے زیرِ سایہ پرورش پانے والے افراد کے ذہنی اور جذباتی نشیب و
 فراز کی اُن گنت تصویریں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ کہیں کہیں
 ان تصویروں میں علامتوں کا رنگ مزور نظر آتا ہے۔ لیکن جہاں
 تک ان تصویروں اور پیکروں کا تعلق ہے، یہ رنگ ان میں کوئی

خاص کیفیت پیدا نہیں کرتا۔ ان میں تو جو کیفیت ہے وہ یہ ہے کہ یہ تصویریں بہ ذاتِ خود نہیں ہیں اور اپنے ساتھ بے شمار ایسی تصویریں کو پیدا کرتی ہیں جن سے ان کے سسٹم میں اضافہ ہوتا ہے اور بھی کی وجہ سے ان کے اثر کا دائرہ زیادہ وسیع ہو جاتا ہے اور اس اثر میں شدت بھی خاصی پیدا ہو جاتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ غالب کی بنائی ہوئی یہ تصویریں اور تراشے ہوئے یہ پیکر نئے نہیں ہیں۔ یہ عزّی کی روایت ہیں غالب سے قبل بھی موجود تھے۔ شاعروں نے ان سے کام بھی لیا تھا لیکن غالب سے قبل ان میں فرسودگی کے آثار نظر آتے تھے۔ غالب نے ان میں نئی زندگی پیدا کی اور کچھ ایسے رنگ بھرے جو خامے گھرے اور تیز تھے۔ کچھ ایسے خطوط بناتے جو خامے تیکھے اور پہلدار تھے۔ مثلاً سے وساعز، ساق، بزم سے، سے پرستی، کشہ کامی و میسو سے جو تصویریں سامنے آتی ہیں وہ اس کے علاوہ بھی نہ جانے کیا کیا کچھ کہتی ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ نہ جانے کتنی اور تصویریں کو پیدا کرتی ہیں۔ یہ تصویریں کہیں سیاسی اعتبار سے عروسی، عاشقانی اعتبار سے پامال اور اخلاقی اعتبار سے پس ماندگی کی تصویریں کو نمایاں کرتی ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ کچھ کرنے کی خواہش اور اس زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سنوارنے کی آرزو کی تصویریں بھی ان میں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ غالب کے تجربات کا تنوع ان تصویروں کو بنانا اور ان پیکروں کی تخلیق کرتا ہے۔

ان تصویریں اور پیکروں کے ساتھ ساتھ غالب کی شاعری میں

چمن ، باغ ، گل ، فتنہ ، خوشبو ، ہنر ، خزاں ، بہار ، باغبان ، صحران
 بیابان ، دشت ، غار ، عذیب ، بیل وغیرہ کی تصویریں اور پکیر بھی
 انجبرے جوتے نظر آتے ہیں۔ ان کو تخلیق کر کے بھی غالب نے ایک
 نئی کارنامہ انجام دیا ہے۔ یہ تصویریں بھی ظاہر ہے کہ نئی نہیں ہیں۔
 فارسی اور اردو شاعری کی روایت میں ان تصویروں اور پکیروں
 کی ایک باتاواہ جگہ ہے۔ لیکن غالب نے ان میں بھی اپنے تجربات
 کا بہرہ دوڑا کر ان کی دنیا ہی بدل دی ہے اور اس طرح ان میں
 معنوی اور نئی دونوں اعتبار سے بے اندازہ وسعتیں پیدا کر دی ہیں۔
 یہ اشعار اس صحتِ حال کی وضاحت کرتے ہیں۔

فتنہ سپرنگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل
 خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا !

جوتے گل ، تازہ دل ، دو سپر باغِ فصل
 جوتی بزم سے نکلا سو پریشاں بھلا

مے گئے خاک میں ہم داغِ نشانے نشا
 تو ہوا اور آپ بہ حد رنگِ گلستاں ہونا

وہی اک بات ہے جو یاں نفسِ دہاں نکست گل ہے
 چمن کا جلوہ ہلکا ہے مری رنگیں زانی کا

باغ میں مجھ کو نہ سے جا ورنہ میرے حال پر
بر گل تر ایک چشمِ خونِ فشاں ہو جائے گا

غمِ فراق میں تکلیف سیرِ گلِ مستِ در
بے دماغ نہیں خندہ اتے بے جا کا

رہبرِ یک شیرازہٴ وحشت ہیں اجزائے بہار
ہنرِ بیگانہ، صبا آوارہ، گلِ نا آشنا

گر نہیں مکتبِ گلِ کوتر سے کہے کی ہوس
کیوں ہے گردِ در و حلالِ صبا ہو صبا نا

بخنے ہے جلوہٴ گلِ ذوقِ مستِ شاخِ ناب
چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو صبا نا

خزندہ، مکتے ہی بے بادِ بہار سے
نیائے بے شراب و دل بے ہوائے گل

آہر کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں
ہے گر کہاں رنگِ ہیرا میں جو دامن میں نہیں

سب کہاں کچھ لارو گُلّوں میں خُیاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کو چُناں ہو گئیں

یہ کس بہشتِ ثنائی کی آمد آمد ہے
کو غیر جلوۂ گُلّوں رگِ گذر میں خاک نہیں

خزاں کیا ہے فصلِ گُلّوں کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتمِ بال و پر کا ہے

غُصّہ تاشِ گُفتی اُبرِ بَرگِ مانیّت معلوم
بادِ جوہِ دل بھی خوابِ گُلّوں پر خیاں ہے

پھر اسی انداز سے ہمارا آئی
کو ہونے مسرور و مستِ ثنائی

گُلّوں کو تری صحبت از میں کو پسند آئی ہے
ہر گھنچے کا گُلّوں ہونا آغوشِ کشائی ہے

آغوشِ گُلّوں کشو وہ برا سے دواغ ہے
اے عزیزِ دل! چلے دن ہمارے

چاک مَت کر جیب بے ایام گل
 پکا ادمہ کا بھی اشارہ چاہئے

اں نشاط آمد فصلِ بہاری داد داد
 پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی مجھے

نہیں بہار کو فرمت نہ ہو بہار تو ہے
 طراوتِ چمن و خربتی ادا کیجیے!

اے مہذب یک کتبِ خنِ ہر آشتیاں
 طوفانِ آمد آمد فصلِ بہار ہے

آمد بہار کی ہے جو بُل ہے نرسنج
 اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی

لختِ جگر سے ہے رگ ہر خار شاخ گل
 تاجِ ہند باغبانی صرا کرے کوئی

دور ہے پھر ہر ایک گلِ ولاد پر خیال
 صد گمستان نگاہ کا سامان کئے ہوتے

ان اشعار میں غنچہ پھر شکا بکھنے ، بوئے گل ، بکست گل ، چمن کا جلوہ ، باغ ، گل تر ، سرگل ، سبزہ بیگانہ ، صبا آورہ ، گل نا آشنا ، بدوئے گل ، باو بسار ، ہوائے گل ، گلشن ، لادو گل ، خزن ، فصل گل ، غنچہ ساشگفتی ۱۔ خواب گل ، پھر اس انداز سے بسا آئی ۔ ہر غنچے کا گل ہونا ، آغوش گل کشودہ ، چلے دن بہار کے ، ایام گل ، نشاط آمد فصل بہاری ، طراوت چمن ، طوفان آمد آمد فصل بہار ، آمد بہار کی ہے جو بیل ہے قمر سنج ، شاخ گل ، باغبانی صحرا ، صد گلستاں نگاہ کا سماں کئے ہوئے دیرہ کی جو تصویریں غالب نے پیش کی ہیں ، وہ اگرچہ روایت سے گراستوں رکھتی ہیں لیکن اس میں انہوں نے اپنے تخیل سے نہایت گہرے اور شوق رنگ بھر دیئے ہیں ۔ اور اپنے احساس کی شدت ، جذبے کی گہرائی اور فکر کی گیرائی سے جو نئی معنویت پیدا کر دی ہے ، اس کی وجہ سے ان کے تاثر کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے اور ان میں تقریباً تمام محاسن کو متاثر کرنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے ۔ پھر یہ تصویریں عبوی طور پر اتنی رنگین اور پُرکار ہیں اور ان میں ایسی رچ ہوئی کیفیت ہے جو اردو شاعری کی روایت میں کہیں اور نظر نہیں آتی ۔

غالب کی شاعری میں ان تصویروں اور پیکروں کو ان کے گہرے تہذیبی اور معاشرتی شور نے تخلیق کیا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس تہذیب اور معاشرت کا پورا رچاؤ ان میں موجود ہے جس نے غالب کو پیدا کیا ہے اور جس کے سائے میں ان کی شخصیت

کی ضرورتاً ہوئی تھی۔ لیکن غالب نے اس تہذیب اور معاشرت کو ایک عالمِ انحطاط میں بھی دیکھا ہے۔ اس میں انہیں زوالِ آثار بھی نظر آئے ہیں اور ان کے احساس میں انحطاط و زوال کے یہ تاثرات اس طرح گھل جلی گئے ہیں کہ غالب کی تصویروں کی زنجینی اور رنگین کاری میں ایک کسک کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اور اس کسک کی کیفیت نے ان کی امیجری میں جبری طور پر ایک تھوڑے اور المیہ رنگ کو نمایاں کر دیا ہے اور اس رنگ کے اثرات ان کے یہاں اس قدر پھیلے اور بڑھے ہیں کہ ان کی نشاطیہ اور طریقہ شاعری تک اس سے متاثر ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کی شاعری میں اس المیہ اور تھوڑے رنگ کی ایک لہری دوڑی ہوئی نظر آتی ہے۔

اس صوبتِ حال ہی کا یہ اثر ہے کہ غالب کی شاعری میں آگ اور خون اور آبی کے متعلقات کی تصویریں شاید سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ غالب نے اپنے اظہار و ابلاغ کے لئے ان دو چیزوں کا استعمال جتنی فراوانی سے کیا ہے، شاید اتنی فراوانی سے کسی اور چیز کا استعمال نہیں کیا۔ اس کا سبب درحقیقت یہی ہے کہ غالب نے آگ اور اس کے متعلقات کی تصویروں کے ذریعے سے اس آگ کو پیش کیا ہے جو نہ صرف ان کے دل میں دلی ہوئی تھی بلکہ ان کے آس پاس اور گرد و پیش بھی بھڑک رہی تھی۔ اور خون کی تصویروں کے ذریعے اس دریا سے خون کا نقشہ کھینچا ہے جو نہ صرف ان کے دل میں موج زن تھا بلکہ ان کے آس پاس

اور گرد و پیش میں جس کا ایک سند موج زن تھا اور جس میں طوفان
سے آگے رہے تھے۔ پھلے آگ، شعلہ، دھواں اور خاکستر و غیرہ
کی تصویریں دیکھئے۔

بہن کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موتے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا

دل مرا سو زبناں سے بے مہا باہل گیا
آتش خاموشی کی مانند گو یا جہل گیا

دل میں ذوق وصل دیا دیار ہم جاتی نہیں
آگ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو صحت جہل گیا

میں عدم سے بھی پرے ہوں حد نہ غافل بارہا
میری آوازیں سے بالِ عفت جہل گیا

عزیز کیجئے جو ہر اندیشہ کی گری کس
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صراحت جہل گیا

دل نہیں بچہ کو دکھا آدرزِ داغوں کی ہزار
اس چراغاں کا کروں کیا کار فرما جہل گیا

میں ہوں اور اندر دلی کی آرزو غالب کر دل
دیکھ کر طرزیہ چاک اہل ہنسب جل گیا

شب کہ برق سوزِ دل سے ذہرۂ ابر آب تھا
شعلہ جوالہ ہر اک سلقہ گر ماب بخت

فرش سے تاعرش وں طوفاں تھا موج رنگ کا
یاں زمین سے آسماں ہمک سوختن کا باب تھا

جاتا ہوں داغِ حسرت بہتی لٹے ہوئے
مہوں شمع کشتہ درخورِ معضل نہیں رہا

شمع بجتی ہے تو اُس میں سے دھواں اٹھتا ہے
شعلہ عشق سے پرکشش ہوا میرے بعد

کیوں بھل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے
مہرِ گرم نالہ داتے شرار دیکھ کر

جنتا ہے دل کر کیوں زہم اک بار سبیل گئے
اسے ناتما ہی نفسِ شعلہٴ بارِ حیف

یک نظر بیشِ نہیں فرستِ مہتی غافل
گر مئی بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غلمِ مہتی کا اسد کس سے ہو بزمِ مرگِ علاج
شمعِ ہر رنگ میں ملتی ہے سحر ہونے تک

اک شررِ دل میں ہے اس سے کوئی گہرائے گا کیا
آگِ مطرب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

پینا پر نیاں میں شعلہٴ آتش کا آسان ہے
وے مشکل ہے حکمتِ دل میں سوزِ غم چپانے کی

اس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجا دے
میں بھی بجے ہوں میں ہوں داغِ ناما می

تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھو دکھو ذکرِ ہاں
مذر کر دمرے دل سے کہ اس میں آگِ دلی ہے

جی جے ذوقِ فنا کی ناستا می پر نہ کیوں
ہم نہیں جیتے نفس ہر چند آتش بار ہے

آگ سے پانی میں بجتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی دراندگی میں تاسے سے ناچار ہے

رم کر ظالم کو کیا بودِ چراغِ کشتہ ہے
بنیٰ بیابانِ دانا بودِ چراغِ کشتہ ہے

دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے بے
دردِ بیاں بے رونقِ سودِ چراغِ کشتہ ہے

ہم خراباں خاشی میں بھی نوا پر واز ہے
سرِ نوکھوے کو دو دشمنِ آواز ہے

دُشمنِ ہے اس مہنّی آتشِ نفس کو ہی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقی منہ بجھے

جلوۂ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل کسی
نورِ شہرِ قیامت کسی کی آب و گل میں ہے

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
سوزِ عشم ہائے ہنسی اور ہے

آتشِ کدہ ہے سینہ مرا رازِ ہنساں سے
اے وائے اگر مرضِ اظہار میں آدے

مگر گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اتہ
ہے چراغِ غصہ و ناشاکِ گلستانِ تجھ سے

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتشِ غالب
کہ کھائے نہ لگے اور بجھائے نہ سینے

نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا
کوئی تباہ کر وہ شریخِ تند غم کیا ہے

سنی میں خامہِ غالب کی آتشِ انسانی
یقین ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

ان اشعار میں آگ ہی آگ ہے۔ کہیں یہ آگ عالمِ ایسی میں
پاؤں کے نیچے آکر ایک عالمِ اضطراب اور بے پنی کی کیفیت کو
پیدا کرتی ہے کہیں اس کی وجہ سے مخلوق نہ بغیر سوتے آتشِ دیدہ کی

صورت اختیار کرتا ہے۔ کہیں وہ سوز نہاں سے دل کو بے مہا
 جلاتی ہے۔ کہیں آتش خاموشی کی طرح دل کو جلانے کا عمل اس کے
 ہاتھوں میں مہوتا ہے۔ کہیں وہ گھر کو آگ لگاتی ہے اور ہر چیز کو
 جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔ کہیں وہ آہ آتشیں سے بال صفت کر
 جلاتی ہے۔ کہیں وہ جوہر اندیش کی گرمی کا روپ اختیار کرتی ہے
 کہیں وحشت کے خیال سے صحران کو جلاتی ہے۔ کہیں اس کے اثر
 سے حلقہ گرداب ہمک شعلہ حمار بن جاتا ہے۔ کہیں وہ زمین سے
 آسمان تک سوختن کے باب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ کہیں وہ
 نالہ ہائے شرر بار بن جاتی ہے۔ کہیں رقبہ شرر میں اس کا
 عکس نظر آتا ہے۔ کہیں وہ غصہ کو جلاتی ہے اور کہیں اس کو شمع
 کشتہ بنا دیتی ہے۔ کہیں دل میں ایک شرر بن جاتی ہے۔ کہیں
 دل میں اپنے آپ کو دباتی ہے۔ کہیں نفس کو آتش بار بناتی ہے۔
 کہیں پانی میں اپنے آپ کو رو دنا کرتی ہے۔ کہیں سوز غم ہائے
 نہانی کی وجہ سے سینے کو آتش کہہ بناتی ہے۔ کہیں بگم گرم سے
 چپکتی ہے۔ کہیں وہ عشق بن جاتی ہے اور کہیں غائب غائب کی
 آتش منافی کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ غرض اس طرح غالب کی
 شاعری میں آگ نے آن گشت روپ اختیار کئے ہیں اور ان کے
 فن میں بعض ایسی تصویریں کو تخلیق کیا ہے جو ان کی روحانی مزاجی
 کو ظاہر کرتی ہیں اور جہی کی وجہ سے ان کے فن میں گرمی اور
 روشنی کا احساس ہوتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ غالب کی شاعری میں آگ اور اس

کے تعلقات کی تصویریں ایک عالم اضطراب کی پیداوار ہیں اور مزاج کی بے پیمانی کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس اضطراب اور بے چینی کا وجود ان ناسازگار حالات کے نتیجے میں ہوا ہے جن میں غالب نے زندگی بسر کی ہے لیکن ان کے ساتھ لگاؤ اور اُس دوار و شوق نے پیدا کیا ہے جو ان کے مزاج کا لازمی جز تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آگ اور اس کے تعلقات ان کے یہاں ناسازگار حالات کی ترجمانی ہی نہیں کرتے، حسن اور زندگی اور طاقت کی علامت بھی بن جاتے ہیں۔ اگر یہ صورت نہ ہوتی تو وہ اس قسم کے شر نہ کہتے۔

نہ شعلے میں یہ کر شر نہ برق میں یہ ادا
کوئی بناؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے

دھونڈے ہے اُس منقہ آتش نفس کو بھی
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا بجے

غالب یہاں شعلے میں ایک کر شر اور برق میں ایک ادا دیکھتے ہیں اور اس کر شرے اور ادا کو محبوب شوخ و تند طرکی اداؤں اور کر شرؤں کے ساتھ ایک مناسبت پیدا کرتے ہیں۔ گویا ان دونوں چیزوں میں انہیں حسن نظر آتا ہے اور وہ ان میں زندگی محسوس کرتے ہیں۔ اسی طرح منقہ آتشِ نفس کی جو تصویر انہوں نے بنائی ہے اس سے بھی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے حواس اپنی تسکین بلکہ تسکین کے لئے اس آتشِ نفسی کی تپنا کرتے ہیں جو ان کے خیال میں

ایک مفتی کا طرہ امتیاز ہے ۔

غالب کی شاعری میں آگ کی تصویروں کے ساتھ ساتھ برق اور بجلی وغیرہ کی جو تصویریں مفتی ہیں ان سے بھی یہ بات صریح ثابت ہوتی ہے کہ وہ ان چیزوں کو جس اور زندگی اور طاقت کی علامت سمجھتے ہیں ۔ برق اور بجلی کا تعلق بھی بہو حال کسی نہ کسی طرح آگ اور آتش سے مندر ہے ۔ غالب کو ان کے ساتھ بھی ایک ذہنی مناسبت ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں ان کی تصویریں بھی جگہ جگہ ملتی ہیں ۔ یہ اشارہ دیکھئے ۔

مری تیر میں مغز ہے اک صورت خرابی کی
ہیولا برقِ خوشن کا بے خون گرم دہقان کا

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ انفت سستی
مہات برق کی کرتا ہوں اور انکس حاصل کا

شب کو برق سونہ دل سے زہرہ ابر آب تھا
شعلہ جوار ہر اک حلقہ گر داب تھا

گرنی تھی ہم پر برقِ شعلہ نہ طوفان پر
دیتے ہیں بادہ عرف قدحِ خوار دیکھ کر

م نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش ازیک نفس
برق سے کہتے ہیں روشن شیخ نام منان ہم

روقی مہستی ہے عشق غاۓ ویراں سازے
انجن بے شیخ ہے گر برق خرمن میں نہیں

قفس میں مجھ سے دواد وچمن کہتے نہ ڈر مہدم
گری تھی جس پہ کل بھل وہ میرا آئیاں کیوں ہو

نہ شے میں یہ کر شر نہ برق ہیں یہ ادا
کوئی جاؤ کہ وہ شرف مند خوکیا ہے

غائب کا کمال یہ ہے کہ اُنہوں نے برق خرمن، برق کی مبدلت
برق سویدل، برق تہن، برق سے کہتے ہیں روشن شیخ نام منان
ہم، انجن بے شیخ ہے گر برق خرمن میں نہیں، گری تھی جس پہ
کل بھل، نہ شے میں یہ کر شر نہ برق ہیں یہ ادا و عزیز کی تصویر میں
صرف برق اور بھل ہی کی تصویریں نہیں بنائی ہیں ۱۰ اپنے تخیل کے
دنگوں سے کام لے کر کچھ اور تصویریں بھی بنائی ہیں جن کو تخیل کی
میلک ہی سے دیکھا جاسکتا ہے۔

آگ، آتش، دھواں، شرر، برق اور بھل کی تصویریں اور
پیکروں کے ساتھ ساتھ غائب کی شاعری میں خون اور بہرہ دینے کی

تصویریں اور پیکر بھی بہت نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ ان تصویروں کے حوالے اور عزائم بھی وہی ہیں جو آگ، آتش، برق اور بجلی وغیرہ کی تصویروں کے ہیں۔ غالب نے انسانی زندگی کی ایک ایک بات پر اپنے دل کو خون کیا ہے، اس کے ایک ایک پہلو پر وہ خون کے آشوروں سے ہیں، اس کے ایک ایک نشیب و فراز پر انہوں نے خون کے دریاؤں کو موجزن دیکھا ہے، اور اس کے ایک ایک انقلاب پر انہوں نے خود خون کے دریا بہا دیے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ خون کی ایسی تصویریں ان کے مزاج کا تجزیہ بن گئی ہیں۔ اور وہ اس تصویر کو اپنے بعض اہم تجربات کی ترجمانی کے لئے استعمال کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ یہ دیکھنے کو کیسے کیسے عجیب تجربات کو انہوں نے خون کی تصویریں بنا کر پیش کیا ہے۔

تجربہ پھر لگا کھیلنے آج ہم نے اپنا دل
خون کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

دل تا پھر کے ساحل دریائے خون ہے اپنے
اس رنگند میں جلوہ لگی آگے گردِ صفت

خوشی میں منہاں خون گشتہ لاکھوں آسند تیں ہیں
چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہو گا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری ہڑلہ کا

عبودہ گل نے کیا تھا وہاں چراغاں آبِ جو
یاں رواں ہڑلہ چشمت ترے خونِ ناب تھا

ناگہل اس رنگ سے خونِ ناب ہٹکانے لگا
دل کو ذوقِ کارشیںِ ناخن سے لذتِ باب تھا

ایک ایک قلعے کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر و دھیتِ مسٹرگانِ مارِ صفا

رگِ رنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ سپر نہ سخت
چمے عیشِ بکھر رہے ہو یہ اگر دشوار ہوتا

پتے نذرِ کرم تختہ ہے شرمِ کارستانی کا
جنوں غلیظہٴ صد رنگ و صوفی پارستانی کا

نہ لدا جان کر بے جرم تاملِ تیری گردن پر
روماندِ خونِ بے گناہ حقِ آشنائی کا

باغ میں مجھ کو نہ سے جاوے نہ میرے حال پر
ہر گل تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

رخسہ گردب گیا ہو نہ صحت
نام گر رک گئی روانہ ہوا

بے خون دل ہے چشم میں موجِ نگرِ غبار
یہ سے کہہ خواب ہے سے کے سراغ کا

دردِ دل کھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلاؤں
آنکھیاں نگار اپنی خامِ خوں چکلاں اپنا

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے
پُرِ گل خیالِ رخسہ سے دامنِ نگاہ کا

موجِ خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے آئو جاؤں کب

خوں بے دل خاک میں احوالِ بٹاں پر مین
اُن کے ناخن ہوئے متاجِ حنا میرے ہند

ہے خون جگر جوش میں دل کھل کے رہتا
ہوتے جو گئی دیدہ خوں نامہ فشاں اور

اسد بہل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
کہ مشقِ ناز کو خونِ دو عالم میری گردن پر

عاشقِ مہرِ طلب اور تفتابِ تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک

منصف سے لے کر یہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اڑ گیا جو خوں کو دامن میں نہیں

میں اور صد ہزار نواسے جیگرِ خاش
تو اور ایک وہ نہ شنید کہ کیا کہوں

خنجر سے پیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں چھری چھو ہرزہ گر خون چکاں نہ ہو

نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے رہیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ بھول گا کہ تیشیں دوسرے روزاں ہو گئیں

دفا کیسی کہاں کا مشق جب سر پہوڑنا سہڑا
تو پھر اے نگدل تیرا ہی سگب آستان کیوں ہو

نہ اتنا پریش تیغ جفا پر ناز مند اؤ
مرے دریائے بیتیابی میں سے اک موجِ خون وہ بھی

انہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
اُٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شرمی بہانے کی

علائکہ ہے یہ سیلِ غار سے لارِ رنگ
غافل کو میرے شیشے پہ سے کا گان ہے

عمر ہر چند کہ ہے برقِ خدایم
دل کے خوں کے کرنے کی فرمت ہی بھی

شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذتِ فراق ہے
تکلیف پر وہ داری جسمِ سبک گئی

پھر جگر کھودنے لگا ناخ
 آمرِ نفسِ لارِ کاری ہے

کھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خون چکان
 ہر چند اس میں اتھ ہمارے قلم ہوئے

رچک رہا ہے بدن پر سو سے پیرا ہی
 ہاری جیب کو اب حاجتِ رنوک ہے

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
 جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر سو کیا ہے

نخشِ غمزہ خون ریز نہ پوچھ
 دیکھ خوں تابِ منشانی میری

جے موجِ نلکاں تلامِ خوں لاشِ یہی ہو
 آتا ہے ابھی دیکھتے کیا کیا مرے آگے

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے رنگ
 نہ دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

پھر بھرتا ہے غمارِ مژگان ہ خونِ دل
سانہ چمن طرازیِ داماں کئے جوئے

غالب نے ان اشعار میں اپنے متنوع تجربات کی ترجمانی کی ہے لیکن ان میں سے ہر ایک کا انحصار خون کے بیان سے ہوا ہے۔ ان میں سے بعض اشعار کا موضوع ہی خون ہے لیکن بعض ایسے ہیں جن کا موضوع خون نہیں ہے لیکن انحصار کے لئے خون کے تصور کو استعمال کیا گیا ہے۔ اس طرح ان میں سے ہر ایک شعر کسی نہ کسی زاویے سے خون کی تصویر کو پیش کرتا ہے۔ یہ خون کی تصویر احساس اور جذبے کی شدت اور نگو کی گہرائی اور انسان کے انفرادی اور اجتماعی معاملات کے گہرے شور کو ظاہر کرتی ہیں۔ اور پڑھنے والے کے حواس پر براہِ راست آن کا اثر ہوتا ہے۔ لیکن ان تصویروں کو پیش کرنے اور پیکروں کو تراشتے ہیں غالب کی کوئی شعری کوشش شامل نہیں ہے۔ ان کے مخصوص مزاج اور مخصوص امتدادِ طبع نے ان سے ان تصویروں کی تخلیق کرائی ہے۔

یہ تو غالب کے ایسے اشعار ہیں جن میں براہِ راست خون کی ایسی تصویر اور پیکر ابھر کر سامنے آتے ہیں لیکن ان کی شاعری میں بعض اشعار ایسے بھی ملتے ہیں جن میں بات تو خون کی نہیں ہے لیکن جن میں سے مجبوری طور پر خون کی تصویر مزور ابھرتی ہے اور کم و بیش وہی اثر کرتی ہے جو ایسے

اشعار کرتے ہیں جی میں براہ راست خون کی تصویریں کس یاں
 ہوتی ہیں۔ یہ اشعار اسی میلان کے ترجمان ہیں

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دست کا کمانوں زربا
 آستیں میں دسٹنہ نہاں ہاتھ میں خنجر کھٹکا

دوست غزالی میں میری سی فرائیں گے کب
 ذمہ کے بڑھنے تک ناخن نہ جھو آئیں گے کیا

آج داں تیغ دکھن باز سے ہوتے جانا ہوں میں
 عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

کوئی میرے دل سے ہرچے ترے تیر غم کش کو
 یہ غلط کہاں ہے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

ہم کہاں قسمت آزمانے جاتیں
 تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

عذاب کیا ہے میں خاص اوجھر دیکھ
 شہیدان نگہ کا خون بہا کیا

ان آجوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
 بھی خوش ہوا ہے ماہ کو پرخار دیکھ کر

میں اور صد ہزار فراسے مسگر خواش
 تو اور ایک وہ نہ شنیدن کو کب کہوں

خبر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم
 دل میں چڑی پہنچو بڑا گر غل چکاں نہ ہو

نہر گئے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو
 یہ لوگ کیوں ہرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر چھوڑنا ٹھہرا
 تو پھر اسے شکل دیتا ہی عجب آستان کیوں ہو

حالانکہ ہے یہ سیلی خار سے لاد رنگ
 فاضل کو میرے شیشے پہ سے کا گمان ہے

انہیں منظور اپنے زخموں کو دیکھ آتا تھا
 اُسے تھے سیر گل کو دیکھنا شونی بہانے کی

شوق ہو گیا ہے سبز خوش لذت فراغ
تکلف پر وہ داریِ رخصت ہو گئی

پھر بگڑ کھودنے لگا ناخن
اسدِ فصلِ لالہ کاری ہے

ان اشعار میں آستین میں دھرتی پنہاں، اداقت میں خنجر کھولا،
زخم کے بڑھتے تک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا، گدھر میرے قتل کرنے
میں وہ اب لائیں گے کیا، یہ غلطی کہاں سے ہوتی جو بگڑ کے پار
ہوتا، صد ہزار فرائے بگڑ خراش، خنجر سے پھر سینہ، دل میں
چھڑی چھبوا، یہ لوگ کیوں مرے زخم بگڑ کو دیکھتے ہیں، جب سر
چھوڑتا صھڑا، سیلے خار سے لالہ رنگ، اپنے زخموں کا دیکھ آتا،
شوق ہو گیا ہے سینہ، دھیرہ کا جو بیان ہے اس میں کہیں نہ کہیں کسی نہ
کسی طرح خون کی تصویر مزور سامنے آتی ہے اور حواس پر وہی اثر
کرتی ہے جو خون کی تصویروں والے اشعار کرتے ہیں۔

غالب نے بعض بڑی دل کش اور دلآویز تصویروں اور پیکروں
کی تخلیق تسلیمات اور تشبیہات و استعارات کے سلسلے میں کی ہے۔
عام طور پر تسلیمات اور تشبیہات و استعارات کو کلام کا زیور سمجھا
جاتا ہے۔ لیکن غالب کی شاعری میں ان چیزوں کا یہ قصود نہیں ہے۔
ان کے خیال میں تو ان کا مقصد اظہارِ حال و باخ ہے۔ چنانچہ وہ
اسی مقصد سے ان کو استعمال کرتے ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ

غالب نے انعام و اجلاغ میں ان تمیمات اور تہنیتات و استعارات سے بڑا کام لیا ہے۔ تخیل نے ان میں بڑی زندگی اور جولانی پیدا کی ہے اور ساتھ ہی ان کو رنگین اور پُرکار بھی بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تمیمات اور تہنیتات و استعارات میں احساسِ ہمال کی تسکین کا بھی خاصا سامان موجود ہے۔

پہلے تمیمات کو دیکھئے۔ یہ اشعار کیسے رنگین اور پُرکار ہیں اور کیسی جان دار اور زندگی سے بھرپور تصویروں اور پیکروں کو آنکھوں کے سامنے لا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔

تینے بنیہ بنیہ مرزا سکا کو بکن اسد
سرگشتہ نہار رسوم و قیود بخت

ہم خن میٹھے نے فراد کو شیریں سے کہا
جس طرح کاکر کسی میں ہو کال اتجا ہے

شوق ہر رنگ رقیبِ سرو سامان نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی حوایا نکلا

مر گیا صدہ یک مجنبت لب سے غالب
تا توانی سے حریف دم میسے نہ ہوا

کب وہ کمزور کی خُدائی تھی
سبندگی میں مرا بھلا ہوا

میں نے مجنوں پر لڑکیں میں اسد
تنگ آٹھایا تھا کہ سہ یاد آیا

گہری تھی ہم پر برق تہیٰ نہ طور پر
دیتے ہیں بادِ غربت قدحِ غوار دیکھ کر

سلطنت دستِ بہت آئی ہے
ہام سے خفا تم ہمیشہ نہیں

قید میں یعقوب نے لی گونہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روشن و پوار زنداں ہو گئیں

عشق و مزدوریِ عشرتِ بگِ خرد کیا خوب
ہم کو تقسیم نکونائیِ بسندہ و نہیں

سب رقیبوں سے ہوں خوش پر زبانِ مہر سے
ہے نہینا خوش کہ مہرِ بادِ کشاں ہو گئیں

دستگاہ دیدہ خوشبار مجنوں دیکھنا
یک بیاباں جلوہ گل و شبنم پا انداز ہے

بے مَرَد ہی گزشتہ ہے ہو کر چہرہ خضر
حضرت ہیں گل کہیں گئے کہ ہم کیا کیا کیسے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ بھی ہم سفر ہے

ہم سخنِ تیشے لے فراد کو شری سے کیا
جس طرح کا بھی کسی میں ہو گمانِ اچھا ہے

قد و گیسو میں قیاس و کوہن کی آرائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آرائش ہے

اک کبیل ہے اور نگہ سیماں مرے نزدیک
اک بات ہے اہماز میماں مرے آگے

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کے رہن کرے کوئی

ان اشعار میں تمیسات کا استعمال بعض روایتی انداز میں نہیں
 ہوا ہے اور یہ تمیسات صرف ان تصویروں اور پیکروں ہی کو
 نمایاں نہیں کرتیں جن کو عام طور پر غلامی اور اردو غزل کی روایت
 میں نمایاں کیا گیا ہے۔ ان میں قرآنِ تمام تصویروں اور پیکروں
 کے ساتھ غالب نے کچھ اور تصویروں اور پیکروں کو بھی اُجھارا ہے۔
 مثلاً کوکبن کی مثالی تصویر ان اشعار میں نہیں اُکھرتی۔ غالب اس
 کی مثالی تصویر کے بہانے ان تصویروں کو اُجھارتے ہیں کہ وہ غالب
 رسوم و قیود کا سرگشتہ تھا۔ اس لئے بشیر تپشہ کے زمر کا۔
 لیکن پھر یہ تصویر ان کے سامنے آتی ہے کہ تپشہ ہی اس کے لئے
 سب کچھ تھا۔ تپشہ ہی کی بدولت اسے شیریں سے ہم کلام ہونے
 کی توفیق عطا ہوئی۔ اسی طرح قیس کے بیان میں قیس سے زیادہ
 شوق اور اس کی بے سرو سامانی یا اس سے ہمدردی کی تصویر
 زیادہ اُکھرتی ہے۔ کم و بیش یہی صورت ان اشعار کی ہے جن
 میں لیتوب، خضر، کندر، سیکلان، یوسف اور زینا وغیرہ کا
 ذکر ہے کہ ان میں ان کی مخصوص روایتی تصویروں کے علاوہ غالب
 بعض ایسی تصویروں اور پیکروں کو بھی اُجھارتے ہیں جن میں ان
 کے نئے احساس و شعور کا رنگ نسبتاً زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔
 کم و بیش یہی حال ان تصویروں اور پیکروں کا ہے جو غالب
 کی شاعری میں تشبیہات و استعارات کے وسیع سے پیدا ہوئی
 ہیں۔ ان میں بھی غالب اپنی شغفیت کے مخصوص رنگ و آہنگ
 کو زیادہ نمایاں کرتے ہیں اور ان کے احساس و شعور کی رنگ آمیزی

ان میں نئے پہلوؤں کو پیدا کر کے نئی تصویروں کو آشکارا ہے۔
غالب کے تخیل کی بلندی اور بلند پروازی ان تصویروں میں نئے
نئے رنگ بھرتی ہے اور ان کے خطوط میں تیکھا پن پیدا کر کے
ان میں نئی زندگی دوڑاتی ہے۔

ان اشارے اس کا اندازہ ہو گا۔
نقش فریادی ہے کس کی شوقی تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

میں کہ ہوں غالب اسیری میں ہیں آتش زیر پا
موتے آتش دیدہ ہے علقہ مری زنجیر کا

دل مراسوڑ نہاں ہے بے مہا باہل گیا
آتش خاموش کی مانند گویا سبیل گیا

دل تا جگر کہ حاصل دریائے فوں ہے اب
اس رہگذر میں جلوہ گل آگے گرد تھا

دگو تلک سے پکتا وہ لہو کہ پھر نہ صحت
چمے غم کبھ رہے جو وہ اگر شہدار ہوتا

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ ترے جلنے لے
کر سے جو پر تو غور شبید عالم بھینساں سما

خوشی میں شہاں خوں گشتہ نامکوں آرزو میں ہیں
چراغِ مژدہ ہوں میں بے ذہاں گور غریباں سما

ہنوز اک پر تو نقش خیالِ یاد باقی ہے
دلِ افسردہ گویا ہجر ہے یوسف کے زنداں سما

میں ہیں کہ جوشِ یاد سے شیفے اُتھیل رہے
ہر گوشہ بھاؤ ہے حشرِ شیشِ ہاتھ سما

شبِ ہوائی پیرِ انجمِ رخشندہ کا شکر کشد
اسِ تکت سے کہ گویا بت کہ سے کا درِ کھلا سما

آلا دل نے دئیے اوراقِ مستِ دلِ بہاؤ سما
یاد کا آلا اک دیوانِ بے شجرہ مست سما

کون قریب ان ہی وسیع انِ الجے
دشتِ گردِ کچھ کے کھنڈرِ یاد آ سما

بجلی اک کو نہ گئی آنکھوں کے اگلے کوکب
ہات کرتے کہیں لب تشہ لقتسیر بھی تھا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا متبدار کا عالم
میں مستند نغمہ عشر نہ ہوا مت

جاتا ہوں داغِ حسرت بہتی لیے ہوئے
ہوں شمع کشتہ در غورِ محفل نہیں رہا

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
بر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نثار اور

نخلِ نغمہ ہوں نہ پردہ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

اک نغمہ ہمیش نہیں فرمست بہتی غافل
گر مٹی بزم ہے اک رقصِ شر ہوئے تک

نغمہ ہستی کا اسد کس سے ہر تہِ مرگِ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے عر ہونے تک

برشکالِ دید، عاشق ہے دیکھا چاہئے
کھل جی، اند لگی سرباسے دیوارِ چین

جہن تیرا نقشِ مستم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں اِرم دیکھتے ہیں

جوتے خوں آنکھوں سے بنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ کھوں لگا کر کشیں دو فروزاں ہو گئیں

یکس بہشتِ شاکی کی آمد آمد ہے
کہ غیرہِ تجلوہ لگی رہ گذر میں خاک نہیں

جب وہ جہلِ دلفروزِ سورت مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوزِ پرے میں مزہ چائے کیوں

اُسی شے کی طرح سے جس کو کوئی بھاڑے
میں بھی جلے بوڑی میں ہوں داغِ غنا سہا

چشمِ خواہاں غامضی میں بھی نوا پر واز ہے
سرورِ تو کوئے کہ دو درِ ششوارِ آواز ہے

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دورِ بھاگے ہے اسد
پاس مجھ آتشِ بہاں کے کس سے ٹھنڈا جائے ہے

کارگاہِ مہستی میں لالہ داغِ سدا ہے
برقِ خرمینِ راحتِ خونِ گرمِ دہقان ہے

مہوہ زارِ آتشِ دوزخِ جہارِ دلِ سہیں
فرقہ خورِ قیامتِ کس کی آبِ دلِ میں ہے

دیکھو تو دھڑبھڑائی اندازِ نقشِ پا :
سوجِ خرامِ یارِ بھی کب لگی کترِ غمی

آتشِ دوزخِ میں یہ گرمی کہاں
سوڑِ غمِ اے نہانی اور ہے

نما ہی جیسے گر جائے دمِ مکررِ کاغذ پر
مری قسمت میں یوں تصویر ہے شبِ اے جہاں کی

یاشب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہٴ بساط
روانِ باغِ باں و گنبدِ گلِ زمش ہے

تلف غلام ساق و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

نہ شے میں یہ کرشمہ برق میں یہ ادا
کوئی بناؤ کہ وہ شوخِ نندہ خاکِ سیاہ ہے

نہیں نگاہ کو آفت نہ ہو نگاہ تو ہے
روانیِ روش و مستیِ ادا کہئے

یہ اشار ہیں بے شمار تصویروں کو پیش کر رہے ہیں وہ منہ
سے بول رہی ہے ۔ یہ تصویریں نئی ہیں ۔ ان میں نئی زندگی ہے ۔ نیا
مرد ہے نئے رنگ ہیں ۔ نئے خطوط ہیں ۔ یہ سڑک ہیں ۔ ان میں
مرداری کی کیفیت ہے ۔ یہ نہ جانے کیا کیا کچھ کہتی ہیں ۔ اور نہ
جانے کن کن زاویوں سے کس پر اثر انداز ہوتی ہیں ۔ اور یہ
سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ یہ غالب کے نئے احساس اور نئے
شعور کی تخلیق ہیں ۔ غالب نے ان کے ہر رنگ میں جلوۂ صد
رنگ پیدا کر دیا ہے ۔

عزمی جہاں تک تصویر کاری اور پیکر تراشی یا ایجری کا تعلق
ہے غالب ایک پہلو دار فن کار ہیں ۔ انہوں نے جی تصویروں کی تخلیق
کی ہے ان میں بڑی زندگی ہے ۔ وہ بڑی جان دار ہیں ۔ ان میں
بولانی اور سماجی کا احساس بھی جوتا ہے ۔ وہ چلتی پھرتی اور بولتی

سہنی نظر آتی ہیں۔ ان تصویروں میں یک رنگی نہیں بلکہ رنگا رنگی ہے۔ ان میں بڑا تنوع ہے۔ بڑی وسعت اور ہر گیری ہے۔ غالب کی شخصیت اور ان کے ماحول نے ان تصویروں کی تخلیق کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں بڑی گہرائی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ گہرائی غالب کے انفرادی اور اجتماعی تجربات کے صحیح ہاسیاتی اظہار کی مرہونِ منت ہے۔ غالب کے تخیل نے ان تصویروں کو رنگین اور چرکار بنانے میں بڑا کام کیا ہے اور ان میں سے ہر ایک میں کچھ ایسے رنگ جبرے ہیں جو مدورہ جاذبِ نظر ہیں۔ ان تصویروں کا اثر براہِ راست حواس پر ہوتا ہے اور ان میں انسان کے تمام حواس کو متاثر کرنے کی بڑی صلاحیت ہے۔ غالب مسمات کے شاعر ہیں اور حسنیاتی کیفیت کے اثرات

ان کی شاعری میں بہت نمایاں ہیں۔ یہ تصویریں اس جہتی کیفیت میں خدّت پیدا کرتی ہیں اور اس طرح ان کے ہمتوں احساسِ جمال کی لکھی کا بڑا سامان پیدا ہوتا ہے۔

غالب کی شاعرانہ فن کاری میں جو رضائی ہے اُس کی بنیاد ان کی یہی تصویر کاری، پیکر تراشی یا امیجری ہے۔ وہ زندگی کے شاعر ہیں۔ اور اس زندگی کے مختلف اور متنوع پہلوؤں کی ترجمانی ان کی شاعری کا خاص میدان ہے۔ اس ترجمانی کی بنیاد ان کا احساس اور شور ہے۔ اس احساس و شور کے ارتعاش ہی کا نام ان کی شاعری ہے۔ غالب نے اس ارتعاش کو ان بے شمار تصویروں اور پیکروں میں مجسم کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری اور ان تصویروں اور

پیکروں کا ایک حسین نگارخانہ ہے۔ غالب نے ان تصویروں کا خام مواد اپنے نئی مسلمات، آس پاس اور گرد و پیش کے حالات معاشرتی اور تمدنی روایات، اور ذہنی و فکری تحریکات سے حاصل کیا ہے۔ اور اپنے تخیل سے خاطر خواہ کام لے کر ان تصویروں میں جان ڈال دی ہے جو ان کے تجربات کے اہم ترین تیار ہوئی ہیں۔ یہی ڈے یوکس نے لکھا ہے کہ ایک شاعر کسی بھی چیز کو سامنے رکھ کر حین سے حین تصویروں کی تخلیق کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ چیز اس کے تخیل کو پوری قوت سے حرکت میں لا کر اس سے خاطر خواہ کام لے سکے۔ غالب کی تصویر کاری پر یہ قول صادق آتا ہے۔ انہوں نے زندگی کی معمولی چیزوں کو تصویروں اور پیکروں کا روپ دیا ہے۔ لیکن اپنے تخیل سے، جن کی ان کے پاس فراوانی تھی کام لے کر ان میں زندگی کی لہر دوڑا دی ہے۔

یہ تخیل شاعری کے لئے ایک دولت بخش ہوا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی طاقت ہے جو شاعری میں گرمی اور روشنی کو پیدا کرتی ہے۔ کورج نے اس کو شاعری کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اور اس پر فلسفیانہ بحث کی ہے۔ شیلے کے خیال میں تخیل ایک دہوتا ہے جس کی پرستش برشاو کے لئے ضروری ہے۔ سی۔ ڈی۔ یوس نے لکھا ہے کہ وہ صلاحیت جو شاعری میں تصویروں اور پیکروں کی تخلیق کرتی ہے اور ان کو دوسروں تک پہنچاتی ہے وہ شاعر کا تخیل ہے۔ غالب نے اس تخیل کو اپنی شاعرانہ فن کاری میں بڑے پلٹے سے استعمال کیا ہے۔ اور اس سے بڑے بڑے کام لئے

ہیں۔ خاص طور پر ان کی تصویر کاری اور اسجری میں یہ تخیل نئے نئے زاویوں سے اپنے آپ کو روخا کرتا ہے۔ اس تخیل کے صبح اور شام مناسب استعمال ہی کا یہ اثر ہے کہ ان کی تصویروں میں شدت اور جہولانی کے عناصر اتنے نمایاں دکھائی دیتے ہیں اور اسی تخیل ہی کے اثر سے ان کی تصویروں اور پیکروں میں پڑھنے والوں کو متاثر کرنے کی صلاحیت بیدار ہوتی ہے اور یہ تینوں چیزیں ایسی ہیں جو بقول ڈیے یوس اعلیٰ درجے کی تصویر کاری اور بلند پایہ پیکر تراشی کے لئے ضروری ہیں۔

اُنے نے ایک جگہ اپنی تصویر کاری اور پیکر تراشی کے بارے میں لکھا ہے کہ شاعرانہ تصویریں اس کے یہاں تاثر کے نتیجے میں پیدا ہوئیں۔ لیکن وہ صرف تاثر ہی تک محدود ہو کر نہیں رہ گئیں۔ ان تاثرات نے اس کی ذات کے اندر سیکڑوں قسم کے ادب اختیار کئے۔ شفا جستانی، زندگی اور جہولانی سے بھرپور اچھیلی اور خوب صورت، بے شمار رنگوں میں رنگے ہوئے اور ان تمام تاثرات کو تخیل کی طاقت نے مختلف صورتوں میں پیش کیا۔ اور انہوں نے شاعرانہ تصویر کاری اور پیکر تراشی کی صورت اختیار کر لی۔

غالب کی تصویر کاری پر بھی گوئے کی یہ بات صادق آتی ہے۔ انکی تصویر کاری اور پیکر تراشی کا تخلیقی عمل میں کم و بیش اسی طرح جلدی رہا ہے اسی لئے جہانگیر تصویر کاری کا تعلق ہے وہ گوئے کے ہنرمعلوم جوتے ہیں اور ان دونوں میں بڑی حد تک ایک مماثلت پائی جاتی ہے۔

زبان و بیان

شاعری میں سارا کھیل زبان کا ہوتا ہے بلکہ کتنا زیادہ صحیح ہے کہ شاعری زبان ہی زبان ہے اور زبان کے سوا کچھ نہیں۔ زبان ہی سے شاعری میں بھرتا اظہار و ابلاغ کی صحت اختیار کرتے ہیں۔ زبان ہی سے وزن و آہنگ، تہتم اور موسیقیت کی تخلیق ہوتی ہے۔ زبان ہی سے علامتوں اور اشاروں کا وجود ہوتا ہے۔ زبان ہی ایسبیری یا تصویر کاری کو زندگی دیتی ہے۔ فرض شاعری میں زبان اُن گنت کام کرتی ہے اور اس میں بے شمار پہلو اس کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور زبان الفاظ کے نظام کا نام ہے۔ الفاظ جب انسان کے کسی خاص تجربے کے تحت ایک مخصوص صحت اختیار کرتے ہیں تو شاعری وجود میں آتی ہے۔ اس میں شہ نہیں کہ شاعری کی بنیاد جذبات و احساسات اور افکار و خیالات

ہیں جن کو شاعر اپنے تجربات کی شکل میں پیش کرتا ہے ۔
لیکن یہ تجربات اسی وقت شاعری کہلاتے جاتے کے قابل ہوتے
ہیں جب ان کا انحصار تازہ ، مستغنیہ ، شاداب ، مستترمز اور ہیرے
کی طرح ترشخی ہوئی زبان میں ہوتا ہے ۔

غالب کی شاعری اس معیار پر پوری اترتی ہے ۔ ان کے فن
میں زبان کو نمایاں مقام حاصل ہے ۔ وہ زبان کے بند پایہ نوکار
ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ انہوں نے زبان کے استعمال کو
ایک فن بنا دیا ہے ۔ انہوں نے اپنی شاعری میں جہاں جاتی اندر
کے لئے جو زبان استعمال کی ہے وہ زندگی سے بھرپور ہے ۔ (۲۱)
میں بڑی جہدانی ہے ۔ بڑی جدت اور تازگی ہے ۔ بڑی ہی شگفتگی
اور شادابی ہے ۔ بڑی ہی رنگین اور پُرکاری ہے ۔ غالب نے
اس کو طرب بنایا ، سنوڑا اور نکھارا ہے اور اس میں شروع
سے آخر تک ایک ہیرے کی طرح ترشخی ہوئی کیفیت پیدا کر دی
ہے ۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ غالب نے زبان کی صنّاعی ہی
کو اپنے پیش نظر رکھا ہے ۔ صرف صنّاعی ان کے یہاں نہیں
ہے ۔ وہ اس کے قائل بھی نہیں ہیں ۔ ان کی زبان تو ان کے
تخلیق مزاج کی آئینہ دار ہے ۔ وہ ان کی شاعری کے مواد کے
ساتھ سنا بہت رکھتی ہے ۔ وہ ان کے تجربات کے ساتھ پوری
طرح ہم آہنگ ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے رنگ و آہنگ
میں ان کی شخصیت اور مزاج کا عکس صاف نظر آتا ہے اور ان
کی طبیعت کی تخلیق کیفیت اپنی تمام جلوہ سائیدوں کے ساتھ

اس میں بے نقاب نظر آتی ہے۔

غالب نے زبان کو ایک نیا مزاج دیا ہے۔ اس کے استعمال میں ایک اجتہادی نشان پیدا کی ہے۔ اور اس اعتبار سے وہ ایک سنوڑد سہیت رکھتے ہیں۔ غالب سے قبل جو زبان شاعری کے لئے استعمال ہوتی تھی وہ اس زمانے کے لحاظ سے تو مناسب تھی لیکن ان کے زمانے تک آتے آتے فن کے تقاضے مختلف ہو گئے تھے۔ چنانچہ زبان کے استعمال میں نمایاں تبدیلیاں ہو چکی تھیں اور ان تبدیلیوں کی وجہ سے ان میں ایک نیا مزاج پیدا ہو گیا تھا۔ اس نئے مزاج کو پیدا کرنے میں غالب کی شاعری اور فن کو نمایاں حیثیت حاصل ہے اور اس اعتبار سے ان کے فن کی حیثیت ایک زبمان بلکہ ایک تحریک کی ہے۔

شاعری کی زبان کا جو انداز غالب سے قبل تھا۔ اس کی صیح مانندگی ایک طرف تو میر اور سوتا کرتے ہیں اور دوسری طرف انشا، جرات اور مصطفیٰ۔ یوں میر اور سوتا کی زبان بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے اور انشا، جرات اور مصطفیٰ میں بھی، جہاں تک شاعری میں زبان کے استعمال کا تعلق ہے، خاصا اختلاف نظر آتا ہے لیکن یہ اختلافات دراصل محدود ہیں اور ان میں سے ہر ایک شاعر کی شاعرانہ انفرادیت کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو میر اور سوتا نے جو زبان شاعری کے لئے استعمال کی ہے اس میں ایک خاص مزاج ملتا ہے۔ اس میں سادگی اور سہولت ہے۔ ایک سیدھا سادہ انداز ہے۔

وہ شیشے کی طرح صاف اور شفاف ہے۔ اس میں رنگینی اور
 پرکاری نسبتاً کم ہے۔ اس میں وہ رچائو بھی کم ہے جو کسی زبان
 میں وقت کے ساتھ ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ اس میں ہندی زبان کے
 اثرات موجود ہیں۔ لیکن ہندی کے اثرات بھی اس میں کچھ کم
 نہیں ہیں۔ اور ان دونوں اثرات نے مل کر اس میں ایک چاشنی
 کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ برخلاف اس کے انشائیات اور معنی
 کی استہول کی ہوئی زبان میں نسبتاً زیادہ پرکاری ہے۔ اس
 میں سادگی اور سلاست کا رنگ زیادہ گہرا نہیں ہے۔ اس میں ہندی
 کی روایت کے اثرات نسبتاً زیادہ نمایاں ہیں۔ اس میں کسی قدر
 صناعتی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ لیکن اس صناعتی میں زیادہ باقاعدگی
 کا پتہ نہیں چلتا۔ برخلاف اس کے زبان کو بنانے اور سنوارنے کے
 مسائل میں کسی حد تک ایک طرح کی بے نیازی سی نظر آتی ہے۔
 ان میں انشا، اس میں شبہ نہیں، کہ زبان کے بہت بڑے مزاج دان
 تھے لیکن جی حالات میں سے ہو کر ان کی زندگی کا قافلہ گزرا
 انہوں نے ان کی اس مزاج دانی کو ایسے مسکرتوں پر بھی ڈال
 دیا جو غیر بنیادی بلکہ ابتذال کی منزل کی طرف جاتے تھے۔ جرأت
 کی ذہنی سطح ذرا نہیں تھی۔ اس لئے وہ شاعری کی زبان میں کوئی
 ایسا رجمان پیدا نہ کر سکے جو نئی، حالیاتی یا مسانیاتی اعتبار سے
 قابل ذکر ہو۔ ان کی شاعری میں مسائل ہندی تھے۔ اسی لئے ان کی
 زبان میں بھی وہ رنگ و آہنگ نظر آتا ہے جو مسائل ہندی کے
 ساتھ مخصوص ہے۔ مسکنی ہے شک، ان میں ایسے شاعر ہیں، جی

کے یہاں زبان کے سائے میں زیادہ سنجیدگی اور باقاعدگی کا احساس ہوتا ہے اور وہ زبان کو نیا رنگ و آہنگ دینے میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان شاعروں کے اثر سے شاعری کی زبان ایک نئی صورت اختیار کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

یہ شاعر غالب کے ہم عصر تھے۔ لیکن جس وقت ان کے فن کا شباب تھا، اس وقت غالب کا فن بچپن کی منزلیں طے کر رہا تھا۔ اس لئے ان شاعروں نے شاعری کی زبان اور اس کے استعاروں میں جو ترجمانات پیدا کئے، وہ ہر صورت غالب کے پیش نظر رہے۔ اور کسی نہ کسی حد تک، شعری طور پر یا غیر شعری طور پر، انہوں نے زبان کی اس بدلتی ہوئی کیفیت کا اثر قبول کیا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ ان کے خاص ہم عصروں میں سے ناسخ نے اصلاح زبان کی ایک تحریک چلا دی اور عملی طور پر شاعری کی زبان کو سوار نے اور بکھارنے کی کوشش کی اور اس کی ذوق پلک کو درست کیا۔ یہ اور بات ہے کہ خیال، موضوع اور مواد سے رشتہ توڑ لینے کی وجہ سے زبان نے ان کے یہاں صرف مقامی کی صورت اختیار کر لی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاعری بندش الفاظ اور بندش الفاظ نگوں کے جڑنے کے مترادف سمجھی گئی اور اس کو ایک مرتفع ساز کا کام تصور کر لیا گیا۔

غالب اپنے زمانے کے ان رجحانات اور رجحانات سے کسی نہ کسی حد تک متاثر ہونے لگا۔ اس کا ایک بہت واضح ثبوت تو یہ ہے کہ ان کے فن پر ایک دور ایسا بھی گزرا ہے جب انہوں

نے تاسخ کا تیج کیا ہے، اور ایسے اخبار بھی لکے ہیں جو تاسخ کے اشعار کے ساتھ مفاہمت رکھتے ہیں۔ میر کی ابیت کا انہوں نے خود امتزاج کیا ہے اور انہیں دیکھنے کا اتنا تسلیم کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ان کے بنائے ہوئے راستے پر چوڑی طرح چل نہیں سکے ہیں کیونکہ ان کے مخصوص مزاج نے اپنے لئے نئے راستے بنائے ہیں۔

اس فنی اور سانی پس منظر کو سامنے رکھے بغیر غالب کی زبان کا صحیح تجزیہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ شاعری کی زبان میں یہ میلانات اور ترجمانات دراصل وہ سرچشمے تھے جن سے غالب نے اپنی شاعری کی زبان کا بیولا تیار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار کسی نہ کسی ذریعے سے ان کی استمال کی جوتی زبان ہیں اپنی جگہ منسرد دکھاتے ہیں۔

یہ اشعار اپنی اپنی جگہ اہم مزدور ہیں اور غالب نے ان کی ابیت کو تسلیم بھی کیا ہے۔ لیکن فارسی زبان اور فارسی کی شاعری روایت کے اشعار بھی ان کی زبان میں بڑے گہرے اور ہمہ گیر ہیں۔ غالب کو فارسی زبان پر پورا عبور حاصل تھا۔ وہ فارسی کے بند پایہ شاعر تھے۔ بلکہ اپنے آپ کو بنیادی طور پر فارسی ہی کا شاعر سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی شاعری کی روح اور اس کے نقش اُتے رنگ رنگ کو اگر دیکھنا ہو تو ان کی فارسی شاعری کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ان کی اردو شاعری کا عبور فارسی کے مقابلے میں بے رنگ ہے۔

خامی ہیں سا بہ جینی نقش آتے رنگ رنگ
 مہر از مہر آردو کہ بے رنگ میں است

غالب نے اس شعر کے پہلے مصرعے میں جس خیال کا اظہار کیا ہے اس سے تو اتفاق کیا جاتا ہے لیکن دوسرے حصے میں جس خیال کا اظہار ہے اس سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ ان کا اردو کا مہر بے رنگ نہیں ہے۔ اس میں تو نقش آتے رنگ رنگ کا ایک مہر مد رنگ ہے جو دلوں میں اپنی جگہ بناتا ہے اور حواس پر ایک سرخوشی بن کر چھا جاتا ہے۔

غالب کے اردو کلام میں جو رنگینی اور رچاؤ ہے اور جس نے اس کو نقش آتے رنگ رنگ کا مہر مد رنگ بنا دیا ہے وہ ندری زبان کی رنگینی اور رچاؤ کا مرکب بنتا ہے۔ ندری زبان کے اثر سے ان کی زبان میں شیرینی اور عذابت، رنگینی اور رمانی کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ انہوں نے ندری کے اضافہ کو استعمال کر کے اور ان کی بے شمار ترکیبوں کو تلاش کر اپنی زبان میں اس طرح کھپایا ہے کہ ان کی خاموشی کی زبان میں گل بوٹے سے بکھے ہوئے اور چھ زار سے سکراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

یہ اشعار دیکھتے سے

دل سا جگر کو ساحل دریائے خون سے اب
 اس رہ گزرد میں مہر کل آگے گرد تھا

اجاب چارہ سازتی دشت نہ کر کے
زندانی میں بھی خیال بیاہاں فردست

ہوائے ہیر گلی آئینہ بے مہرئی ستار کی
کہ اندازہ ہوں غلطیوں پہل پسند آیا

جراحت تھوڑی، الماس ارمان داغ بگر ہے یہ
بہلک باد اسد فزارِ جاں درد مند آیا

ہوں ترسے وعدہ نہ کرنے پر بھی راضی کہ کہیں
کوششِ منت کش گھبراہٹ نہ سہا

بیان کیا کیجئے بیداد کا دیش ہائے شرکوں کا
کہ ہر اک قلوہ خون داز ہے قیسِ فرماں کا

رنگِ ٹھٹھہ سج بسا رنگارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتگی گئی اتنے ناز کا

تاراج کا دیش غم بھراں سہا اسد
سینہ کو تھا دھینک کر اسے راز کا

جبرۂ گل نے کیا ستا دلیں چوٹاں آب جو
یاں رماں بڑا گلیں چشم ترے غولِ ناب تھا

ناگہں اس رنگ سے غولِ ناب ہٹکانے لگا
دل کو ذوقِ کاوشِ نائن سے لذتِ باب تھا

بکھر نہ کی اپنے جنوں نار سانسے وہ زیاں
ذرتِ ذرتِ روکشِ غورِ شیدِ عالمِ تاب تھا

اب میں ہوں اور ماتم یک شہرِ آرزو
توڑا جو ترے آئینہ کشال وارِ صفا

گلیوں میں میری نقش کو کھینچنے پھر دیکھ میں
جاںِ عادتِ ہوائے سرِ بگزارِ صفا

نوازشِ آئے بے جا دیکھتا ہوں
شکایتِ آئے رنگین کا جھلا کب

دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے
غمِ آوارگی آئے صبا کب

داغ سنگفتہ پیرا بساؤ نشاؤ دل
ابر ہمار ٹکدہ کس کے داغ کا

ذرتہ ذرہ ساغر سے خانہ نیزنگ ہے
گردشِ مجنوں پر چٹکائے میل آشنا

رہلہ یک شیرازہ وحشت میں اجڑائے ہمار
سبزہ بیگانہ سب آوارہ گل نا آشنا

خانل بوجہم تمار خود آرا ہے در زیاں
بے شازہ صبا نہیں عروہ گیارہ کا

نور اور آرائشِ خیم کا کل
میں اور اندیشہ ہائے دور و راز

یک تقریش نہیں فرست بہت خانل
گرائی بزم ہے اک رقصِ شر ہونے تک

منہیں بزم کرے ہے گنبد باز خیال
ہیں ورق گردانی نیزنگ یک بت خانہ ہم

مُصرتِ کار و بارِ شوقِ کسے
ذوقِ تنہا رہی مہال کس

رونی بہتی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انہی بے شمع ہے گر برقِ غم میں نہیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگِ ہزمِ آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نیاں ہو گئیں

گلِ خفاں اے نازِ سبزو کو کیا ہو گیا
خاک پر ہوتی ہے تیری کارِ کاری اے لئے

کس طرح کاٹے کوئی شبِ اے مارِ چنگال
ہے نظرِ خورِ دہِ اخترِ شماری اے لئے

دشتِ گاہِ دیدہ خونِ بارِ مہزونِ دیکھنا
یک بیاہاں جہو، گلِ فرشِ پا انداز ہے

قنبرِ ہاشمِ شفقِ ابرگِ عافیتِ معلوم
بادِ بود و ملی خوابِ گل پریشاں ہے

دیکھو تو دلفریبی انداز نقشِ پا
سوجِ خرام یار بھی کیا نکل کھڑی

پھر کچھ اک دل کو بیستہ رہی ہے
سبز جو یائے زخیم کاری ہے

پھر سب کھو دئے لگا ناخن
آدھ کھل لار کاری ہے

وہی سد رنگ نار منہ مانی
وہی صد گونہ اشک باری ہے

جنوں تہمت کش تکیں نہ ہو گزاردانی کی
نمک پاش خراشِ دل ہے لذت زندگانی کی

ساقی بہ جہوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مُلو بہ نغمہ رہزنِ تلخیں و دلکش ہے

یاشب کو دیکھتے تھے کہ ہر گونہ بسا
دامنِ باغِ بید و کنبہ گلِ فردش ہے

لطف خرام ساقی و ذوقی مدائے چنگ
یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے

ان اشعار میں دلِ تاجگر کو ساحلِ دریائے خون ہے اب ،
چارہ سازِتی وحشت ، زنداں میں بھی خیالِ بیاہاں نورد تھا ، ہوائے
سیرِ گل ، آئینہ بے مہرِی قاتل ، کہ اندازِ جنوں غلیظِ بدنِ بیلِ جرات
تھوڑا ، افسانہ ارغوان ، داغِ جگر ہے یہ ، منت کش گھبراہنگِ تسلی ، بیدار
کاوش اُسے مڑگاں ، رنگِ شکست ، صبح بہارِ نثار ، شگفتگیِ گل
اُسے ناز ، تاراجِ کاوشِ غمِ ہجران ، مڑگاںِ چشمِ تر ، ذوقِ کاوشِ
ناخن ، روکشِ خورشیدِ عالمِ تاب ، باجمِ یک شہرِ آرزو ، جانِ داود
ہوائے سرِ گھنڈا ، نوازشِ اُسے بے جا ، شکایتِ اُسے رنگیں ،
داغِ حشرِ پیراہی ، غمِ آوارگی اُسے صبا ، بباطِ نشاطِ دلِ سلور
سے خاندانِ نیرنگ ، گردشِ جنوں پر چمک اُسے بیلِ آشنا ، ربط
یک شیرازہٴ وحشت ، بے خاندانِ صبا ، آرائشِ غمِ کاکل ، اندیشہٴ بے
دور و دراز ، گرئیِ بزم ، رقصِ شرر ، ورقِ گردانیِ نیرنگِ یک
بتِ خاندانِ فرست کارِ دلِ شوق ، ذوقِ نثار ، جل ، حشمتِ خاندانِ ویران
ساز ، رنگِ رنگِ بزمِ آرائیں ، نقش و نگارِ طاقِ نیل ، گلِ نشانی
اُسے نازِ جلو ، شب اُسے سارِ برنگال ، ٹوکروہٴ آخرِ شام
دستِ گاو ویدہٴ خونِ بارِ جنوں ، یک بیاہاںِ صبوہٴ گل ، فرسشِ پا
انداز ، نغمہٴ تاسِ گشتِ ا - دھڑبھی اندازِ نقشِ پا ، صوحِ خرامِ بار
جو اُسے زحمتِ کاری ، صد رنگِ نازِ فرسائی ، آہِ فصلِ کارِ کاری

صد گونہ اشک باری، جہن تہمت کش نکلیں، زمک پاشو خواش دل
 روشن ایمان و آگہی، رہزن تکیں و ہوش، دامان باغیاں و کتب گل فروش
 لطف خرام ساقی حلقہ صدائے چنگ، بہت نگاہ اور زود ہی گوش
 و غیرہ کی جو حسین اور دکلاویز، رنگیں اور پُرکار ترکیبیں غالب نے
 تراشی ہیں، وہ اُن کا ایک نئی کارنامہ ہیں۔ اردو شاعری میں ایسی
 دل کش اور سادہ نظر ترکیبیں کسی اور شاعر کے یہاں نہیں ملی سکتیں۔
 غالب ان ترکیبوں کو تراشنے میں صرف اس وجہ سے کامیاب
 ہوئے کہ وہ فارسی زبان پر پوری طرح تسلط رکھتے تھے اور اس کا
 رنگ و آم جگ غالب کی شخصیت کا جز بن گیا تھا۔ یہی وجہ ہے
 کہ غالب کی تراشی ہوئی ان ترکیبوں میں اُن کی کوئی شعوی کشش
 اور کادکش نظر نہیں آتی۔ اسی لئے ان میں شاعری کے عمل کا احساس
 نہیں ہوتا۔ وہ تو اُن کے یہاں قطری انداز میں ایک تخلیقی عمل کے
 طور پر وجود اختیار کرتی ہیں اور ان کے ساتھ درتہ جذباتی تجربات
 اور رنگیں اور پُرکار افکار و خیالات کا مکمل اظہار و ابلاغ ان
 ترکیبوں کے ذریعے سے ہوتا ہے۔

غالب نے فارسی کی ان بے شمار رنگیں اور پُرکار ترکیبوں کو
 تراش کر صرف اظہار و ابلاغ کا حق ادا کیا ہے بلکہ جمالیاتی اعتبار
 سے بھی اپنی شاعری کی زبان کو حد درجہ رنگیں اور پُرکار بنا دیا
 ہے اور ساتھ ہی ان کی وجہ سے شاعری کی زبان میں نئے
 امکانات کے چراغ روشن ہوئے ہیں اور نئی دستوں کی خمیں
 دفن ہوئی ہیں۔ ادیہ غالب کا بہت بڑا نئی کارنامہ ہے۔ اس

یہی سبب نہیں کہ غالب نے اس کا تجربہ کیا لیکن ان کے زمانے ہی میں اس تجربے نے ایک روایت کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس روایت کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ روایت اور اس روایت کے اثرات غالب کے بعد آنے والے اردو کے تقریباً تمام اہم شاعروں کے یہاں اپنا عادی و جگاتی ہوئی نظر آتی ہے۔

غالب کی شاعری میں زبان کا استعمال ہمیشہ موضوع کی مناسبت سے ہوا ہے۔ فارسی زبان کے اثرات ان کی شاعری میں جو اتنے گہرے نظر آتے ہیں، اس کا سبب بھی یہی ہے کہ وہ اپنے موضوع اور زبان کے درمیان ایک مناسبت پیدا کرنا چاہتے تھے۔ فارسی ان کے مزاج میں رچی ہوئی تھی۔ اس لئے جب بھی انہوں نے اردو زبان کی تنگ دامانی کا احساس ہوا تو وہ اس میں دست کو پیدا کرنے کے لئے فارسی کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور جہاں تک غالب کی شاعری کے موضوعات کا تعلق ہے ان میں تنہا تھا، وسعت اور گہرائی تھی۔ وہ تمام انسانی زندگی سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے ان کے مکمل اظہار و ابلاغ کے لئے فارسی کا سہارا لینا لازمی تھا کیونکہ اس سہارے کے بغیر خالص اردو ان موضوعات کے اظہار و ابلاغ کے قابل نہیں تھی۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ غالب فارسی زبان کے جمالیاتی رنگ اور اس کے مثنوی آہنگ کے قائل تھے۔ انہیں اس بات کا احساس بھی خد یہ تھا کہ فارسی ایک مفہم و تنہی روایت کی علمبردار ہے۔ اس لئے انہوں نے اپنے فن کا

جایاتی ڈھانچہ اسی زبان پر استوار کیا اور اپنی کوششوں سے ایک نئی زبان کی شاہکار ممت میسر کر دی۔

موضوع کی مناسبت سے زبان کو استعمال کرنے کے شعور ہی کا یہ اثر ہے کہ غائب کے بیان زندگی کے پیچیدہ، اہم اور گہرے مضامین فارسی کے سہارے ہی شاعری اودھن کا حقیقہ بنے ہیں۔ لیکن سید سے سادے مضامین کو غائب نے فارسی کے اثر کے بغیر سیدھی سادی عام اردو میں بھی پیش کیا ہے اور اس طرح اس مناسبت کے باعث ان کے سید سے سادے اشعار بھی جایاتی اعتبار سے خامی اجیت کے مالک معلوم ہوتے ہیں۔ صرف چند اشعار اس صورت حال کی وضاحت کے لئے کافی ہیں۔

مانِ دل نہیں معلوم کیسکی اس قدر مین
ہم نے بار بار ڈھونڈا، تم نے بار بار پایا

دل میں پھر گریہ نے اک شور اُٹھا یا غائب
اے جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفان نکلا

گونہ کھجوں آس کی باتیں گونہ پاؤں آس کا جید
پرہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پکر کھلا

مزنہ کھٹے پر ہے وہ عالم کو دیکھا ہی نہیں
 زلف سے بڑھ کر نقاب اس شمع کے مزنہ پر کھلا

حق خبر گرم کو نقاب کے اڑی گئے پرنسے
 دیکھنے ہم بھی گئے تھے پستاشا نہ ہوا

ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
 آج ہی ٹھسر میں بوریا نہ ہوا

گھر ہارا جو نہ دوتے بھی تو دیراں ہوتا
 بھر اگر بھر نہ ہوتا تو بیاں ہوتا

ہوئی ممت کو نقاب فرگیا پر باد آتا ہے
 وہ ہر اک بات پر کناکریوں ہوتا فکیر ہوتا

کوئی دیرانی سی دیرانی ہے !
 دشت کو دیکھ کے ٹھسر یاد آیا

ہم تھے مزنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سی
 آخر اس شمع کے ترکش میں کوئی تیر ہی تھا

لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بستل میں کیا

اُنے ہے بے کئی عشق پر رونا غالب
کس کے گھر گائے کا سیلاب، میرے بعد

سر چھوڑنا وہ غالب نشور یہ حال کا
یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

نرگیا چھوڑ کے سر غالبِ وحشی تو ہے
بیشناس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

منکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پر لوگ
ہم کو بسنے کی بھی اُمید نہیں

دور بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو کتا تا نگہ کو میں

یوں ہی گرتا رہا غالب تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کو ویران ہر عین

انگ رہا ہے درود پوار پہ سبزہ غالب
ہم بیاہاں میں ہیں اور گھر میں ہمارا آئی ہے

کوئی افسید پر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ بھلی
ورنہ کب بات کر نہیں آتی

میں بھی مٹنے میں زبان رکھتا ہوں
لاش پڑ چو کہ مدح کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو چراکے ہے

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

سہاں بیٹے گڑھی کہاں کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

بات پرواں زبان کتنی ہے
وہ کہیں اور سننا کرے کوئی

(ف) اشار میں جو زبان استہلال کی گئی ہے، اس میں غاری سے کہیں زیادہ اردو مادہ کا استہلال ہے۔ غالب غاری جیسے اور انداز میں بات کرنے کے عادی ہیں اور ان کی شاعری میں بلاشبہ اس لیے اور انداز کا پتہ سمجھائی ہے۔ لیکن خیال اور مواد کی نسبت سے جب بھی مزوت پیش آتی ہے تو وہ خالص اردو اور اس کے ٹیٹھ جیسے میں بھی بات کرتے ہیں۔ میرت تو یہ دیکھ کر ہوتی ہے کہ غالب اس خالص اردو زبان کے انداز اور اس کے ٹیٹھ جیسے کو غزل کے مزاج کا جز بنا دیتے ہیں اور ان کی شاعری میں اس کے استہلال سے صرف غزل کے کارگر شیعہ گری

کو نہیں نہیں گنتی۔

اور اس کا بنیادی سبب یہی ہے کہ غالب اردو زبان، اس کے مخصوص انداز، مادہ سے اور لہجے کو ان جذبات و احساسات کی ترجمانی کے لئے استعمال کرتے ہیں جو ہندی زبان کے مخصوص انداز اور لہجے سے بالکل ہی طرح ظاہر نہیں ہو سکتا۔ شفا مندرجہ بالا اشعار میں شور مٹایا، گونہ سبوں اس کی باتیں گونہ پاؤں اس کا مجید، پری پیکر کھلا، زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے سنہ پر کھلا، مٹی خبر گرم، آج ہی گھر میں بوسیا نہ ہوا، گھر بھرا جو نہ روتے ہیں تو دیر ہی ہوتا، ہوئی مدت کو غالب نہ لگیا پر یاد آتا ہے۔ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا، ہم تھے مرنے کو کھڑے، لاگ ہو تو اس کو ہم جھیں ملاؤ، جب نہ ہو کہہ بھی تو دوسرا کھائیں کیا۔ کوئی بتاؤ کہ ہم بتائیں کیا، نہ لکھا تھا ہوں، یہ جانتا اگر تو نہا نہ گھر کو میں۔ ہوں ہی گر روتا رہا غالب آگ رہا ہے، درد دیوار پہ سبز غالب، ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہیں، مفت دھڑ آئے تو کیا بڑا ہے۔ کب وہ سنتا ہے کہانی میری پال بھیجی کڑی کھل کا تیرا، بات پرداں زبان کھتی ہے۔ وہ کہیں اور سننا کرے کوئی، اویڑ کے غزوں، صوبوں اور ترکیبوں میں اردو زبان اور اس کے خاص انداز اور لہجے کے اثرات غالب نظر آتے ہیں۔ غالب نے اس کو اپنے موضوع کی مناسبت سے استعمال کیا ہے اور اس مناسبت نے ان غزلوں، غزوں اور ترکیبوں کو بھی غزل کے مزاج کا جز بنا دیا ہے جو غزل کی روایت کے ساتھ

کوئی خاص شائبہ نہیں رکھتے۔

غالب اس اعتبار سے ایک مستغزنی کار ہیں اور ان کے اس فنی برترے نے حنفی غزل کے لئے نئے فنی امکانات کے دروازے کھولے ہیں۔

فارسی اور اردو زبان کے اتصال بجز امتزاج نے غالب کے فن میں بعض ایسے پہلو پیدا کئے ہیں جو شاید اردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتے۔ مثلاً اس امتزاج سے ان کی زبان میں وہ شیرینی اور سلاست پیدا ہوئی ہے جو ایرانی اور ہندی تہذیبوں کے امتزاج کی نشانی ہے۔ غالب نے فارسی کی شیرینی کو ہندی کی گلوٹ کے ساتھ اس طرح ملا دیا ہے کہ ان کی زبان میں ایک لٹکا مین رنگ پیدا ہو گیا ہے۔ ان کے ایسے اشار میں وہ رنگینی اور رمنائی پیدا نہیں ہوتی جو فارسی زبان کے زیر اثر حنفی ہونے اشار میں ملتی ہے۔ فارسی زبان کے اثرات قرآن کے کام کے اُس حصے میں زبان نظر آتے ہیں جن میں زندگی کے رنگیں پہلوؤں کا بیان ہوتا ہے۔ سن کی کُہلو اور رومانیت اور تمثیل پسندی ہے لیکن زبان کی فارسی اور ہندی رواج کا امتزاج ان کے ایسے اشار میں نسبتاً زیادہ ملتا ہے جن میں اُسوں نے قلبی واردات کو پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گداز کی کیفیت ان میں زیادہ نمایاں ہے اور اسی اثر سے ان کے کام کے ایک حصے میں وہ علامت اور گلوٹ پیدا ہو گئی ہے جو مناساتی شاعری کا طرہ امتیاز ہے۔ یہ چند اشار اس میلان کے بہترین

ترجمہ میں ہے۔

دل میں ذوقِ دل و یادِ رازِ تکِ باقی نہیں
آگِ اس گھر کو لگی ایسی کہ جو تھا بھل گیا

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا ٹکا ہوا
آڑنے سے پیشتر ہی مرادِ نگِ دردِ تھا

میں نے روکاماتِ غائب کو دگر نہ دیکھتے
اس کے پہل گئے میں گڑھنِ کتبِ سیلابِ تھا

ہوئے فرکے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ فوقِ دیا
نہ کہیں جنازہ اُٹھتا نہ کہیں مسزادِ ہوتا

ہے ایک تیر جہں میں دونوں چھوٹے پڑے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا دل سے بگڑ سبدا تھا

جہاں کشت کو غائب کر گیا پر یادِ آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا کر گیا ہوتا

ماتِ دن گردش میں ہیں ساتِ آسمان
جو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرا ئیں کیا

آئے ہے بے کسی عشق پر رونا غالب
بکس کے گھر جانے گا سلاب بلامیرے بعد

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

سنا کر فیتروں کا ہم بھیں غالب
تماشا تے اہل کرم دیکھتے ہیں !

دام پٹا ہوا ترے در پر نہیں ہیں
خاک ایسی زندگی پر کہ پتھر نہیں ہیں

رنج سے خوگر ہوا انسان تڑپتا ہے
مشکلیں اتنی پڑیں جہ پر کہ آساں ہو گئیں

اُس شخص کی طرح سے جس کو کوئی تجھ سے
میں بھی جلتے ہوؤں میں ہوں داغ نامتالی

آگے آتی تھی سب اہل دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر ہنسیں آتی

پھر اسی بے وقت پر مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

آہی سبوتا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی جتنے ہوتے

کیا جیاں کر کے مرادیں گے یار
مگر آشفۃ بستانی میسری

چاہئے کو تیرے کیا سمجھتا دل
باسے اب اس سے بھی کہا جائے

میں جلتا تر ہوں اس کو مگر اسے جذبہ دل
اس پر بن جائے کچھ ایسی کہ پنا آئے نہ بنے

ہزاروں خوابشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے
بہت بچکے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

انہ اخبار کی سب سے نمایاں خصوصیت ان کی ثنائیت ہے۔
ان کی بنیاد سوز و گداز ہے۔ اس سوز و گداز نے ان اخبار میں
عقائد اور گھلاوٹ کو پیدا کر دیا ہے۔ غالب نے ان اخبار

میں جو زبان استعمال کی ہے، اس میں فارسی کے اثر کے ساتھ اردو زبان کے اثرات بھی نمایاں ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں کے حسین اور متوازن امتزاج ہی نے سوز و گداز کی اس کیفیت میں شدت پیدا کر کے ان کو ملاوت اور گلاوٹ سے بہکنا دیا ہے۔

فارسی اور اردو زبان کی روایتوں کا یہ امتزاج بھی غالب کا ایک فنی کارنامہ ہے اور اس نے ان کے فن میں حواس کو متاثر کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم پیدا کر دی ہے۔

غالب کے فن میں جو زبان استعمال ہوئی ہے اس میں الفاظ کا سوتی آہنگ بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ انہوں نے الفاظ کے محسوس و روایت سے بے جا جو اپنے فن میں وہ موسیقیت اور تغلی پیدا کر دی ہے جو پڑھنے اور سننے والوں دونوں کے حواس پر براہ راست اثر کرتی ہے۔ غالب کے یہاں مختلف الفاظ کو ملا کر ایک مترنم کیفیت کو پیدا کرنے کا بڑا سلیقہ ہے۔ یوں تو وہ منفرد الفاظ کی تغلی اور موسیقیت کا بھی گہرا شعور رکھتے ہیں اور انہوں نے تجربات کے اظہار کے لئے موضوع کی مناسبت سے ان الفاظ کے انتخاب میں بھی بڑے فنی کارنامہ شور کا اظہار کیا ہے لیکن

حُفَّتِ افغان کی محفوس ورو بہت سے جو ننگی اور موسیقیت
 پیدا ہو سکتی ہے۔ اس میں غالب اپنا جواب نہیں رکھتے۔ یہی وجہ
 ہے کہ ان کے بیشتر اشعار میں مرکب افغان کے محفوس استحال کی
 وجہ سے پیدا ہونے والی موسیقیت اور ننگی کا کمال نظر آتا
 ہے۔ یہ چند اشعار اشارہ دیکھئے۔

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
 آگِ اس گھر کو نگی ایسی کہ جو ہمت جل گیا

دل تا جگر کہ ساحلِ دریا سے خوں ہے اب
 اس رگِ بذر میں عبودہ گئی آگے گردِ ستا

احباب چارہ سازیِ وحشتِ ذکر سے
 زندان میں بھی خیالِ بیا باں خود ستا

ہوائے سیرِ گلِ آئینہ ہے مہرئی قاتلی
 کہ اندازِ سخنِ قطعیہٗ بسل پسند آیا

خنوشی میں نہاں خوں گشتِ لاکھوں آندہٗ ہیں
 چراغِ مَرودہ ہوں میں بے زبانِ گودِ غریباں کا

نہیں سلوم کسی کس لاہو پانی ہوا ہوا
نجات ہے سرنگ آلود ہونا تیری بڑھان کا

دلگ شکستہ میچ بیدار ہے
یہ وقت ہے ٹھنکن لگی ہائے تاز کا

ہیں ہیں کہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشہ بساط ہے سرشیر باز کا

تاراجِ لادشہ ختم ہجراں ہوا اسد
سینہ کو تھا دھینک گئے رائے کا

گرچہ ہیں دیوانہ پر کیوں دوست لاکھاؤں نزدیک
آئیں میں دشنہ پنہاں اٹھ میں شہزاد کا

داں کرم کو عذریہ بارش مت غلہ گیر غلام
گریہ سے یاں چہرہ بامش کھنڈ بے تاب تھا

سبوت لگنے کیا تھا داں چہرہ غلہ آب جو
ہاں رواں بڑھان چشم سے غلہ تاب تھا

ناگمان اس رنگ سے خونِ نابِ ٹپکانے لگا
دل کو ذوقِ کاوشِ ناز سے لذتِ یاب تھا

نمازِ زاوِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زلفاں سے گھبرائیں گے کیا

نوازشِ اسے بے جا دیکھتا ہوں
شکایتِ اسے رنگیں کا گلا کب

استہم وہ جنونِ جہاں گدستے بے سرو پا ہیں
کو بے سر پنہونِ ہر گلابِ آہرِ پشتِ خار اپنا

باغ میں مجھ کو زے ورنہ میرے حال پر
ہر گلِ ترا یک چشمِ خوںِ نشاں جو جانے لگا

سید میں ہے ترے دشمنی کو وہی زلف کی یاد
اں کچھ اک رنجِ گراں باری نہ بغیر بھی تھا

جاتا ہوں باغِ حسرتِ جتنی بیٹے ہوئے
ہوں شکرِ کشتہ درگورِ محضِ نس رہا

ذتہ ذتہ ساغر سے سنا نہ نیرنگ ہے
گردشِ مہنوں پہ چنگ اتے سیٹھا آشنا

دردِ دل لکھوں کیونکر جاؤں اُن کو دکھاؤں
آنکھیاں نگار اپنی خامہ طعن چکاں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں کیتا تھے
بے سبب ہوا غالب دشمنِ آسمان اپنا

بنشے ہے جلوہ گلِ ذوقِ تاشا غالب
مہشم کو چاہیے ہر رنگ میں داہرہ جانا

چپکے چپکے لب کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر
ہنس کے کرتا ہے بیانِ شرفی گفتارِ درست

شعبِ بخت ہے تراں میں سے اُمتا ہے
شعلہٴ مشق سے پرشش ہوا میرے لہد

خوں ہے دل خاک میں احوالِ تباں پر مین
اُن کے ناخن ہوئے مٹی جہاں میرے بد

خداوند داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ
تنگنگی ہے شہیدِ گلِ خزانِ شمع

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش ازیک نفس
برق سے کرتے ہیں دھنسنے شمعِ ماتمِ خاندہم

آبرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں
ہے گریباں تگ پر پیرا ہی جو دامن میں نہیں

دلتی ہستی ہے عشقِ خاندہمِ سرا سے
انہیں بے شمع ہے گر برقِ غم میں نہیں

غالب مجھ سے شاہِ پاب ہیں کبھی کبھی
پتیا ہیں رونو آبرو شبِ ماتمِ پاب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
میراں ہوں پھر شاہد ہے کس حساب میں

جوئے غم آنکھوں سے بنے دو کہ ہے نامِ ذات
میں یہ کبوں کا کہ شہیں دو فردزاں ہو گئیں

پہنسیں طرزِ دلبری کیجئے کیا کر ہی کے
اُس کے ہر اکاٹھ سے نکلے ہے یہ ادا کر لیں

نکر تا کاغذِ نالہ مجھ کو کیسا مہم تھا مہم
کہ ہو گا باعثِ افزائشِ درم و روپ وہ بھی

مئے عشرت کی خواہش ساقیِ مگر دکن سے کیا کیجئے
مجھے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ داغوں وہ بھی

مرے دل میں ہے غلبہ شوقِ وصل و شکوہِ ہجر
خدا وہ مل کرے جو اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

چشمِ خواہاں غاشی میں بھی نوا پر واز ہے
سُرمہ تو کہے کہ دو شمشیدِ آواز ہے

عشقِ مجھ کو نہیں دشت ہی سہی
میری دشتِ رتی شہرت ہی سہی

سخنِ کشائیِ عشق کی پوچھے ہے کب خبر
وہ دگ رفته رفته سترِ پاپا اُم تھئے

باشپ کر دیکھتے تھے کہ ہرگز نہ ببا
والو بانہاں رکت گلِ فردش ہے

لطفِ خرامِ ساقِ و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گردش ہے

ان اشعار میں دل میں ذوقِ وصل و یار و دلِ ساگرِ کساحل
دیا تے خون، چارہ سازیِ دشت، زنداں میں بھی خیالِ بیاباں فردو
تھا۔ آئینہ بے مہرِ قاتل، اندازِ جنوںِ فطینِ بیل، غرض میں نہاں
خون گشتہ، سرشکِ آلودہ، ہرنا تیری مژگان کا، رنگِ شکستہ، ٹکٹکی
گلِ آنے ناز، جوشِ باد، سے شیشے آچھل رہے، ہرگز نہ ببا
ہے سریشہ باز کا، سارا کج کاوشی ہم جہاں، سیز کہ تھا دھینڈ،
آئین میں دشتِ نہاں، اتر میں خبر کلا، خانِ گیرم خرام، پتہ ہاش
یاں وہاں مژگانِ چشمِ رے خون تاب تھا۔ ذوقِ کاوشِ تاش،
زنداں سے گھبراہٹیں گئے کیا، فردش آتے بے جا، شکایت آتے
رنگیں، جنوں جہاں گدائے، سر پہنہ مژگانِ آہر، ہر گلِ تر ایک
مہشم خون نشان، رنجِ گرانہدنیِ ذخیر، داغِ سرتِ ہستی، ششپ
گشتہ، در غورِ منحل، ساغر سے غاڑِ نیزنگ، گردشِ ہند بچشک
آتے پلا آشتا، آنکھیں فکار اپنی خامرِ خونِ چکاں اپنا ہم کہاں
کے دنا تے کس ہنر میں کیاتے، جلو گل، ذوقِ تماشا، چشم
کو چاہیے، شرفی گفتارِ دوست، شوقِ مشق سے پوش ہوا ان کے

ناخن ہر کے حنا، نشاطِ داغِ غمِ عشق، شہدِ گلِ خزانِ شمع
 بیش از یک نفس، شمعِ ماتمِ غارِ ہم، ہے گر یہاں ننگِ پیرا ہی
 جو دامن میں نہیں، روزِ ابدِ شبِ اجتاب، شود و شاید و شود
 نہیں دو روزِ ان ہو گئیں، پریشانیِ طرزِ دہری، باعثِ افزائش
 دردِ دہوں، سنے عشرت کی خواہش، اک دو چار جامِ واژگوں،
 شوقِ وصل و شکوہ، ہجران، و دو شلہ آواز، میری وحشتِ بیکِ شہوت
 ہی سی، سختِ کشتانِ عشقِ ہر گوشہٴ بساط، دامنِ باغباں دُکھِ گُل
 فردش، لکھتِ خرامِ ساقی و ذوقِ مدائے چنگ و نیز کی ترکیبیں سے
 ننگِ ابدِ مریضیت کے چٹھے سے پھوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں اور
 جو صوفی آجنگِ آن کی تناسب اور تناسب و ردِ لبست سے پیدا
 ہوتا ہے وہ فردِ کسِ گوش کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کو صرف
 محسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔

غالب نے شاعری کی زبان میں بڑی دستیں پیدا کی ہیں۔ ان
 کی زبان محدود نہیں ہے۔ وہ صحیح معنوں میں شاعری کی زبان
 ہے۔ اور شاعری کی زبان ہونے ہی کا یہ اثر ہے کہ اس میں زندگی
 کی سی وسعت اور کشادگی نظر آتی ہے۔ اُن کے یہاں زبانِ الفاظ
 کے کٹرک اور زندہ مجموعے کا نام ہے۔ ان الفاظ میں اُن کے
 خیال کا مہو ہے۔ اُن کے ٹکڑے کی گری ہے۔ اُن کے جذبے کی
 روشنی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زندگی سے بھرپور نظر آتے ہیں اور
 اُن میں بڑی ہی جوفانی کا احساس ہوتا ہے۔ غالب کے استعمال
 کئے ہوئے الفاظ صرف الفاظ نہیں ہیں۔ ان کی حیثیت نکاتوں کی

ہے ، اشعاروں کی ہے ، تمثیلوں کی ہے ، استعاروں کی ہے ۔ وہ
 سیدھے سادے اور پاٹ نہیں ہیں ۔ ان میں تو چلوں اور کیفیت
 ہے ۔ ان کی مسنویت تو بہت پہیلی ہوئی ہے ۔ وہ تو رمز و ایما کے
 پردے میں نہ جانے کیا کیا کچھ کہتے ہیں ۔ پھر سب سے بڑی
 بات یہ ہے کہ یہ الفاظ دیر سے کی طرح ترشے ہوئے ہیں ۔ ان
 کو آپس میں ملا کر اور ایک دوسرے کے ساتھ پوری طرح ہم
 آہنگ کر کے آئینوں نے عکسوں کی طرح پر زبان کے ایک نئے رنگ
 آہنگ کی تخلیق کی ہے اور اس طرح انہوں نے شاعری کی زبان
 کو ایک نئی زندگی سے بھکار کیا ہے ۔ اور اس کو نئے آوازوں پر
 پرواز کرنا سکھایا ہے ۔

یہ زبان اس میں خبہ نہیں کہ ادبی زبان ہے اور غالب کا
 فنی کارنامہ اسی ادبی زبان کی تخلیق ہے ۔ آئینوں نے اپنی شاعری
 میں جو زبان استعمال کی ہے وہ عام لوگوں کی زبان نہیں ہے ۔
 اس میں تو ایک ادبی لب و لہجہ ہے ۔ وہ تو ایک تہذیب کی زبان
 ہے ۔ ایک جاہلیاتی نظام کی زبان ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں
 بڑا رچاؤ نظر آتا ہے ۔ بڑی ہی رنگینی اور رعنائی کا احساس ہوتا ہے
 اور بڑی ہی چڑکاری دکھائی دیتی ہے ۔ مگر جس کاری میں اس کی اہم
 خصوصیت ہے ۔ وہ بھی سبائی ہے اور اس میں تہذیب و آرائش
 کا خاص اہتمام کیا گیا ہے ۔ اس میں بانگہی اور طرح داری ہے
 اور اس کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کو بنانے اور سنوارنے
 کی خاص طور پر کوشش کی گئی ہے اور اس سلسلے میں خاصی محنت

سے کام یا گیا ہے۔ لیکن یہ کوشش اور منت ایک خامر اور
فن کار کی کوشش اور منت ہے۔ اس لئے اس میں نقص کا خاتمہ
ہم نہیں ہوتا۔ بلکہ شروع سے آخر تک ایک فوری رنگ و آہنگ
نظر آتا ہے۔

غالب کی زبان میں اُن کا لہجہ بھی خاص کی چیز ہے۔ اس
لیجے کے استعمال کی وجہ سے ان کی زبان میں نہ صرف پلورہ کیفیت
بلکہ اکثر جگہ ایک ڈرامائی شان بھی پیدا ہو گئی ہے۔ اس ڈرامائی
شان نے اُن کی زبان کو زندگی سے قریب کیا ہے اور اس میں اصیت
اور درحقیقت کی لہر دوڑا دی ہے۔ یہ اشعار زندگی سے کتنے جبرو پڑ
اصیت و واقعیت سے کس قدر ہریز اور آہنگ کے لحاظ سے کس
قدر متحرک ہیں۔

کتنے ہونہو دیں گے ہم دل اگر پڑا پڑا
دل کاں کو گم کیجئے ہم نے دُعا پڑا

جاتا ہے کوئی کشمکش اندر و عشق کی
دل میں اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

کس سے عروسی تمت کی شکایت کیجئے
ہم نے چاہا تھا کہ نہ رہا جس سودہ بھی نہ ہوا

نہیں سلوم کس کس کا سو پانی تہرا ہوگا
قیامت سے سرٹکا، لودہ ہوتا پیری بڑھلے کا

کی مرے تل کے بعد اُس نے جنا سے کوہ
ہاتے آس زود پشیاں کا پشیاں ہوتا

حیف اُس چار گرہ پر سے کی قسمت غاب
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا کرہاں ہونا

پتھر چھت رسوائی انداز استغنائے حسن
دست مڑھو جنا کسار رہے غاندہ ست

بے نیازی تھ سے گذری بندہ پرور کب تک
ہم کہیں گے حال دل اور آپ فرمائیں گے کیا

حضرت ناسخ گرائیں دیدہ و دل درشن راہ
کوئی بوجہ کو یہ تو بجا دو کر بھائیں گے کیا

گر کیا ناسخ لے ہم کو قید اجپایوں سی
یہ جہنم مشق کے انداز جھٹ جائیں گے کیا

ہے اب اس سمیہ میں قبولِ غم آفت اسد
ہم نے یہ مانا کر جلی میں رہی کھائیں گے کیا

سُکھ اچھے خلوت گر جنسِ وفا سن
شکستِ شیشِ دل کی صدا کیا

نہ مے نامے کو آنا مولِ غالب غمِ کھٹکے سے
کو حسرتِ سخن ہوں عرضِ تم نامے بدائی کا

فائدہ کیا؟ سورج آخر تو بھی دانا ہے اسد
دو تہیِ ناماں کی ہے ہی کا زیاں ہر جائے گا

میں اور بزمِ سے سے یوں تشنہ کام آؤں
غریب نے کی سچی قربانی کو کیا بخواست

ہوئی مدت کو غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا مرنے

آئینہ دیکھ اپنا سامنے سے کہے وہ گئے
صاحب کو دل زدِ سینے پر کتنا حزنِ مست

ہو چھتے دس وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بستلہ کہ ہم بستہ نہیں کیا

نہ لڑنا صبح سے غالب کیا ہوا اگر اُس نے شدت کی
ہمارا بھی تو آخر زورِ عظمت ہے گر یہاں ہر

مڑ گیا پھوڑ کے سرِ غالبِ وحشی ہے ہے
بٹھنا اس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

متاثر کر اے عجب آئینہ واری
کچھ کس مت سے ہم دیکھتے ہیں

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پڑ چٹا ہوں اُس بتِ بیداوگر کو میں

وہ بھی کہتے ہیں کہ میں بے ننگِ ذمام ہوں
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

کرنے لکس سُن سے جو عزت کی شکایت غالب
مگر کہے مہرئی یارانِ وطن یاد نہیں

تم اُن کے دعوے کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالب
 یہ کیا؟ کو تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

دل ہی تو ہے نہ شک و شبہ ہے جہز آئے کیوں
 دیتیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر بھوننا پھڑا
 تو پھر سے ٹھنڈی تیل ہی ٹھنڈی آٹاں کیوں ہو

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی
 اسے وہ مجلس نہیں خلوت ہی ہے

جلوہ زار آتش و دوزخ جبارا دل ہی
 فتنہ شورِ قیامت کس کی آب و گل میں ہے

ہے دل شوریدہ غالب علم پر چھوڑا تاب
 رحم کر اپنی تنہا پر کہ کس مشکل میں ہے

مارا زمانے نے اسے اللہ غاں تمہیں
 وہ دوسے کہاں وہ جوانی کہہ سگئی

دلِ نادران تجھے جوا کیا ہے
آئندہ اس درد کی دوا کیا ہے

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
نہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

نہ سٹلے میں یہ کثر نہ برق میں یہ ادا
کوئی تباؤ کو وہ شرمِ تنہا نہ کیا ہے

کب وہ سُنتا ہے کہانیِ میری
اور پھر وہ بھی زبانیِ میری

دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو برس تو سنہ سے کہیں جواب تو دے

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
چلا کر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے

اسدِ غوثی سے مرے اتار پاؤں پھڑل گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں دبا تو دے

مہستی ہے نہ کچھ مہم سے غالب
آخر کر کیا ہے ؟ اسے "نہیں ہے"

ہاں نشاندہ آمدِ فصلِ بہاری واہ وا
پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزلِ خوانی مجھے

ان اشعار میں لمبے کی ساحری ہے۔ الفاظ سیدھے سادے ہیں۔ زبان صاف ہے۔ لیکن الفاظ اور زبان کا استعمال لمبے کی کسی خاص کیفیت اور اس کے مخصوص صوتی آہنگ کو ظاہر کرتا ہے۔ ان اشعار میں سے ہر ایک میں موضوع کی مناسبت سے بات کرنے کا ایک خاص لمبہ ملتا ہے، اور اس لمبے سے ایک مخصوص صوتی آہنگ کی تخلیق ہوتی ہے اور مجموعی طور پر ایک محاکاتی انداز بعض تصویروں کو آشکارا کرتا ہے۔ ان تصویروں میں اُمید اور گمراہی کی کیفیت ان تجربات پر زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کرتی ہے جو ان اشعار کی پسینہ ہیں۔ غالب نے اس لمبے کے استعمال سے دو کام کئے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان میں موضوع کا اظہار و ابلاغ پوری طرح ہوا ہے اور دوسرے مجموعی طور پر ایسی نقابیں پیدا کی ہیں۔ جو احساسِ جمال کی تسکین کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ غالب ان اشعار میں ایک چابکدست فن کار نظر آتے ہیں۔ کہیں انہوں نے اپنی چابکدستی کا اظہار اردو روزمرہ کے استعمال سے کیا ہے، کہیں مکالمے کا انداز پیدا کر کے ایک ڈرامائی شان پیدا کی ہے۔ کہیں صرف لمبے کے استعمال سے

ایک مانوس ماحول پیدا کر دیا ہے۔ کہیں بے ساختگی برسیٹنگ اور بے باکی سے ایک خاص نفا پیدا کر دی ہے۔ غرض غالب نے الفاظ کے مخصوص استعمال سے ہر جگہ ایک مخصوص لمبے کی تحفیں کی ہے اور اس مخصوص لمبے کے استعمال سے ان کی شاعری میں کئی ایسے جاپاتی پلو پیدا ہو گئے ہیں جنہوں نے مجموعی طور پر ان کے فن کو باطن اور طرح داری سے بھنکار کر دیا ہے۔

غالب زبان کے چابک دست فن کار ہیں۔ انہوں نے زبان کے استعمال کو ایک فن بنا دیا ہے۔ اس میں دستیں پیدا کی ہیں۔ اس میں اس تہذیب کا رچاؤ پیدا کیا ہے جس کے سائے میں انہوں نے آنکھ کھولی اور پردہ کش پائی تھی۔ انہوں نے زبان کو خیال اور مواد کے ساتھ ہم آہنگ کیا ہے۔ اور موضوع کی مناسبت سے زبان استعمال کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بیان زبان کے کئی روپ تلاش آتے ہیں۔ کہیں تخیل کی رنگیں کارہاں ان کی زبان کو رنگیں بناتی ہیں۔ کہیں احساس کی شدت اس میں گداز کی کیفیت کو پیدا کرتی ہے۔ کہیں وہ تاریکی کے اثر سے ایسے گلی کرتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے چمن زار سے مسکراتے ہیں کہیں آردو عمارتوں اور روزمرہ کو اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ اس کی سادگی دل میں آ کر جاتی ہے۔ کہیں الفاظ کو حواس اور اشاروں کا روپ دے دیتے ہیں۔ کہیں رمزیت اور ابہامیت کو پیدا کرتے ہیں۔ کہیں الفاظ کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ ان سے نمٹنے اور موسیقیت کے چمچر چوٹنے لگتے ہیں۔ کہیں الفاظ سے ایسے خطوط بناتے اور ایسے رنگ بکھیرتے ہیں کہ بیان میں مقصودی

کی شان پیدا ہوا ہے اور اس طرح جو تصویریں تیار ہوتی ہیں ان میں آجہاد اور گہرائی کی وجہ سے احساس کو متاثر کرنے کا ایک عجیب جامد ہوتا ہے۔ ان کی زبان نہایت شگفتہ اور خاداب ہے۔ اس میں تمازگی نظر آتی ہے۔ اس کے زندہ اور متحرک ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ وہ بہت سی سبائی معلوم ہوتی ہے۔ اور اس میں پرکاری اور رنگین کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔ اس میں بڑا بانگہی ہے بڑی ہی طرح واری ہے۔ بڑی ہی رعنائی ہے۔ بڑی ہی جگہ بٹا ہے بڑی ہی نمایانی ہے۔ ان کے الفاظ ستاروں کی طرح جگہ جگہ تے ہیں اور زبان چاندنی کی طرح مسکراتی ہے۔

اور یہ صورت حال صرف اس وجہ سے ہے کہ غالب نے اپنے الفاظ میں سنوئیت کی بہلیاں بھردی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو گنبدِ معنی کا علم بنا دیا ہے۔

گنبدِ معنی کا علم اس کو سمجھے
جو لفظ کو غالب پرے اشار میں آئے

الحمد لله

غالب کے فن کی اس تفصیل اور اس کے مختلف پہلوؤں کے
 تجزیے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کے
 خالقِ جمال اور ایک بہت بڑے فن کار تھے۔ انہوں نے فن کی اہمیت
 کو سمجھا تھا اور وہ اس کے بنیادی اصولوں کا گہرا شعور رکھتے تھے۔
 ان اصولوں کو برتا ان کے پیش نظر تھا۔ چنانچہ انہوں نے ان
 بنیادی اصولوں کو عملی طور پر بڑے سلیقے سے برتا ہے۔ وہ فن
 کی روایت کے پرستار تھے لیکن اس روایت کو تجربے کے ساتھ ہم
 آجنگ کرنا بھی ان کے پیش نظر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فن
 میں روایت اور تجربے کا ایک حسین اور متوازن امتزاج ملتا ہے
 وہ حسن و جمال کے خدائی تھے اور زندگی اور فن و دونوں میں اس حسن
 کی تلاش و جستجو ان کے پیش نظر تھی۔ چنانچہ وہ اس حسن و

ہمال کی تلاش و جستجو میں سرگرم رہے ہیں اور انہوں نے اس کی تخلیق کو بھی اپنا شہر بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں سن و جمال کی تخلیق مختلف طریقوں سے ہوتی ہے اور وہ اس میں مختلف زاویوں سے اپنے آپ کو رد نما کرتا ہے۔ وہ ایک تہذیب کی پیداوار ہیں اور اس تہذیب کا جمال ان کے فن میں اپنی تمام رنگینیوں اور رعنائیوں کے ساتھ بے نقاب نظر آتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ غالب کے مزاج میں بہادت کے عناصر پوری طرح موجود تھے۔ اور طبیعت اور اعتماد طبع کے اعتبار سے وہ ایک انقلابی تھے۔ اس کی ایک بہت بڑی وجہ انکی روانیت اور دماغ پندی بھی تھی۔ ہر دماغی مزاج فن کار اپنے انہی سے مطمئن نہیں ہوتا۔ خیال سے مکافعت پیدا کرنا بھی اس کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ وہ تو مستقبل میں حُسن و نیائیں بناتا ہے اور ان دنیاؤں کو اپنے تخیل کے رنگوں سے سجاتا ہے۔ وہ صرف سمانے خواب دیکھتا ہے اور انہیں خوابوں کے سلسلے اس کی زندگی بسر ہوتی ہے۔ غالب نے بھی اپنی روانیت پسندی کی وجہ سے یہی سب کچھ کیا ہے۔ وہ کسی چیز سے مطمئن نہیں ہوتے خوب سے خوب تر کی تلاش میں انہوں نے زندگی اور فن کے ان گنت سراؤں کی خاک چھانی ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود انہوں نے ماضی اور حال سے اپنا رشتہ توڑا نہیں ہے۔ انہوں نے روایت سے بہادت مزدور کی ہے لیکن وہ روایت کے معنی

پہلوؤں کی پرستش میں بھی پیش پیش رہے ہیں۔ یہی دوسرے کلاسیک روایت اور رومان ہندی کے باوجود روایت کا رچاؤ اور اس کی رنگینی ان کے فن میں اپنی تمام تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ غالب کے فن کا یہ بڑا کمال ہے کہ اس میں روایت کے اثرات مستند کے ساتھ اپنے آپ کو روٹنا کرتے ہیں۔

روایت کے اثرات میں جو چیز سب سے زیادہ ان کے یہاں نمایاں نظر آتی ہے وہ فارسی شاعری کی روایت اور اس طور پر اس روایت کے ان علمبرداروں کے اثرات ہیں جن کی شاعری نے خود اس روایت کو رنگینی اور چمکار بناتے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ بیدل، گوثی، نظیری اور مہتری کے اثرات ان کے فن میں بہت نمایاں ہیں۔ ان شاعروں نے فارسی شاعری کی روایت کو جس رنگینی اور چمکاری سے آشنا کیا ہے، وہ عمومی طور پر سمٹ کر غالب کے فن میں کچھ اس طرح مزیت کر گئی ہے جیسے کسی صحت مند اور توانا جسم میں تازہ اور رخشاں ہوا دوڑتا ہے۔ غالب نے فارسی شاعری کی روایت سے رنگینی اور رچاؤ کی خصوصیات حاصل کی ہیں۔ اور انہیں اردو شاعری کی فنی روایت کا تجزیہ بنا دیا ہے۔ ان سے قبل اردو شاعری میں مثنوی اور مثنوی دونوں اعتبار سے وہ سنگتگی اور شادابی نہیں تھی جو ان کے اہل قلم پیدا ہوئی۔ غالب کے فن کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے اردو شاعری کی روایت کو ان خصوصیات سے آشنا کیا۔

غالب کے فن میں ایک نشاۃ رنگ اور طریق آہنگ

بھی خاصا نمایاں نظر آتا ہے۔ بظاہر قریہ رنگ و آہنگ ان کی شخصیت اور آفتاد طبع کا ترجمان اور عکاس ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ فارسی شاعری کی روایت کے اثرات بھی ان کے فن میں اس رنگ و آہنگ کو نمایاں کرنے میں برابر کے شریک ہیں۔ غالب سے قبل اس رنگ و آہنگ کی روایت اردو شاعری میں موجود نہیں تھی۔ ابتداً فارسی شاعری میں اس کا ایک سلسلہ ملتا ہے اور خاصی تعداد میں شاعر اس مہکان کے علم بردار نظر آتے ہیں۔ غالب کا فن اس ترجمان سے متاثر ہوا ہے۔ اور اس میں نشاط و طرب کی وہ جو ایک چاندنی سی مسکراتی ہجرتی نظر آتی ہے اس کا سبب فارسی کی یہی روایت ہے جس کو غالب نے اپنے فن میں کچھ اس طرح داخل کیا ہے کہ اس نے اردو شاعری کی دنیا ہی بدل دی ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اردو شاعری کی روایت سے غالب کا کوئی رشتہ نہیں ہے اور یہ کہ صرف فارسی شاعری کی روایت ہی ان پر اثر انداز ہوئی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ غالب نے اردو شاعری کی روایت سے بھی اثر قبول کیا ہے اور یہ اثرات بھی ان کے فن میں نت نئے روپ اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سب سے اہم بات جو اس سلسلے میں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ آئینوں نے فارسی اور اردو کی روایات کے باہمی امتزاج سے ایک تیسری روایت کو پیدا کیا ہے جو ان کا ایک اہم فنی کا نام ہے۔ اس امتزاج نے ان کے فن میں تشاہید اور المیہ رنگ کی

وحدود چھاؤں کو جنم دیا ہے۔ غالب نے ان دونوں کو اس طرح ہم آہنگ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ ان کے فن میں شوق و شبنم ایک دوسرے سے گئے ملتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

غالب کے فن میں روایت کے اثر سے شوقی کا پہلو بھی نمایاں

ہوا ہے۔ یہ شوقی ظاہر ہے کہ صنف غزل کے مزاج کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی۔ لیکن غالب کا کام یہ ہے کہ انہوں نے اس شوقی کو، اور اس شوقی کے اثر سے پیدا ہونے والے ایک مزاج اور طنزیہ انداز کو غزل کے مزاج میں داخل کرنے کی کوشش کی ہے، اور اس کو غزل کے مزاج کا جز بنا دیا ہے۔ اس شوقی اور طنز و مزاح کے عناصر غزل کی روایت میں سیٹھ، واعظ اور زاہد کے بیان میں توڑتے تھے لیکن محن و عشق اور عاشق و معشوق کے مسائل کے بیان میں یہ رنگ فدا مشکل ہی سے نظر آتا تھا۔ غالب پہلے شاعر ہیں جنہوں نے ان مسائل کے بیان میں بھی اس رنگ کو پیدا کر دکھایا۔ وہ اس طرح کو غزل کی روایت میں عاشق اور معشوق کے مسائل سے متعلق ایسے مضامین جو فرسودہ ہو چکے تھے اور مفہم غیر معلوم ہوتے تھے، غالب نے ان کو اپنی غزل میں جگہ تو دی لیکن اس طرح جیسے وہ ان کا خاکہ اڑا رہے ہیں اور ان پر طنز کے جھر پور مار کر رہے ہیں۔ غالب کے اس انداز سے جو شاعری پیدا ہوئی ہے وہ بہ ذات خود بھی اہم ہے۔ کیونکہ اس میں بڑی فکری گنگائی کا احساس ہوتا ہے لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس انداز سے غزل کی روایت کو ایک نیا میدان

ہے اور اس میدان میں اس کو ایک اہم صنف سسٹن کی حیثیت سے اپنے جوہر دکھانے کے مواقع نصیب ہوئے ہیں۔ یہ صبح ہے کہ غاب کے بعد آنے والے غزل کے فن کار غاب کے اس انداز فن کو پوری طرح برتنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں لیکن غاب نے انہیں وہ راستے مزور دکھا دیئے ہیں جن پر چل کر غزل کی صنف اپنے آپ کو فنی اعتبار سے نئی دستوں سے ہم کنار کر سکتی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ غاب نے روایت سے بہت استفادہ کیا ہے۔ اور اس کے اثر سے اپنے فن میں نہ صرف رنگینی اور دچاؤ کی خصوصیات پیدا کی ہیں بلکہ بعض ایسے پہلو بھی اس میں نمایاں ہو گئے ہیں جن کی وجہ سے نہ صرف غاب کے فن میں بلکہ عموماً صنف غزل کے فن میں ایک نئے رنگ و آہنگ نے اپنی جگہ بنالی ہے۔ لیکن غاب اس روایت کے پرستار نہیں ہیں۔ انہوں نے اپنے فن کو اس روایت کی کیر کاغیر نہیں بنایا ہے۔ وہ تو اس روایت کے بندھنوں کو توڑ کر اس کے حدود سے باہر بھی نکلے ہیں اور انہوں نے اپنے فن کو بعض نئے تجربات سے بھی آشنا کیا ہے۔ ان تجربات کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں توازن ہے اور ان کی جڑیں روایت کی زمین میں پوری طرح بیوست ہیں۔ بہرہ جب روایت کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہوتا ہے تو وقت فن کی دنیا میں اسے حیات جاوداں ملتی ہے۔ غاب نے اپنے بہرہ کو روایت کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ کیا ہے۔ اسی

لئے ان کے فن میں اس کی ایک مستقل حیثیت نظر آتی ہے۔

بات یہ ہے کہ غالب نے اپنے فن میں تجربے کے یہ پسرخ مرن تجربے ہی کی خاطر روشن نہیں کئے۔ ان کے پیچھے تو ان کے نئے احساسات اور نئے شعور کا اتھ ہے اور ان نئے احساسات و

شعور کی وجہ سے ان کے یہاں وہ نئے موضوعات و مضامین پیدا ہوئے ہیں جن کے انہار و ابلاغ کے لئے انہیں ان تجربات سے

کام لینا پڑا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے تجربات میں اختراع کا رنگ نظر نہیں آتا اور صرف سنائی کی صورت دکھائی نہیں دیتی۔

وہ اپنی ایک بنیاد رکھتے ہیں اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کو شاعر کے خیال، مواد اور موضوع اور اس کے صحیح جاہلیاتی انہار کے شعور نے پیدا کیا ہے۔ غالب نے بدلتے ہوئے حالات نئے افکار و خیالات اور نئے جاہلیاتی تعصبات سے ان تجربات کا غیر انشایا ہے۔ اسی لئے ان میں ایک استواری نظر آتی ہے اور ایک موانست کا احساس ہوتا ہے۔

غالب کے ان تجربات کی جھلک سب سے پہلے تو ان کی شاعری کے وزن و آہنگ میں دکھائی دیتی ہے۔ غالب نے اپنے موضوعات کی مشابہت سے وزن و آہنگ کو استعمال کیا اور ان میں ایک کل ہم آہنگی پیدا کی۔ ان کی شاعری میں بحرین کا انتخاب، بعض خاص زمینوں کا استعمال، اشعار کی مخصوص دروہیت، ترکیبوں کی تراش ان سب میں ان کا تجرباتی مزاج اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ غالب نے یہ سب کچھ اپنے موضوع کے انہار و ابلاغ

کے لیے کیا ہے۔ غالب نے اپنے وزن و آہنگ میں جوشنگلی اور شادابی اور بلند آہنگی پیدا کی ہے اور اپنی شاعری کو جس نغمگی اور موسیقیت سے مدھناس کیا ہے، اس کی مثال امداد شامسری میں ان سے قبل نہیں ملتی۔ یوں سمجھ سکتا ہے جیسے ان کے فن میں رقص کے چٹنے سے پھوٹ رہے ہیں اور نقموں کے دریا سے موجزن ہیں غالب کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی شاعری میں اس صحتِ حال کو پیدا کر کے اس تجربے کے صوتی آہنگ کو سامنے لا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ جس کی گہرائی کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے موضوع کی مکمل تصویر مع ایک وسیع پس منظر کے آنکھوں کے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے۔

وزن و آہنگ کے اس نئے تجربے کے ساتھ ساتھ غالب نے اپنے فن میں علامتوں اور اشاروں کے استعمال کا بھی ایک اہم تجربہ کیا ہے۔ علامتوں اور اشاروں کا استعمال تو غالب سے قبل بھی امداد شاعری کی روایت میں عام تھا۔ خصوصیت کے ساتھ غزل کے فن میں اس کی ایک روایت موجود تھی۔ لیکن غالب نے اس روایت کو کچھ اور بھی آستور کیا۔ انہوں نے غزل کی روایتی علامتوں اور اشاروں میں نیا طرزِ زندگی دوڑایا۔ اور اپنے وسیع اور جہرگیر موضوعات کو ان کے ذریعے سے ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح یہ روایتی علامات و اشارات نئی معنویت سے آشنا ہوئے۔ اور ان کے دامن میں نئی دستیابی پیدا ہوئی۔ لیکن غالب اپنے موضوعات کی گہرائی اور گیرائی کے پیش نظر اپنے انکار و ابلاغ کو صرف ان علامتوں

اور اشاروں ہی تک محدود نہیں کر سکتے تھے انہیں تو اپنے انفراد
 ابلاغ کے لئے کچھ نئے اشاروں اور علامتوں کی ضرورت تھی ۔
 چنانچہ انہوں نے ان نئی علامتوں اور اشاروں کو تخلیق بھی کیا ۔ یسکی
 اس میں بھی ان کی مٹامی اور ایسا و پسندی کو دخل نہیں تھا ۔ اس کا
 نتیجہ بھی ان کے موزنات کا انفراد ابلاغ اور اس انفراد ابلاغ
 کا جاپاتی احساس و شعور تھا ۔ اسی احساس و شعور کے زیر اثر انہوں
 نے سب سے ایسی علامتوں سے کام لیا جو ان کی جذباتی اور ذہنی کیفیت
 کے ساتھ مناسبت رکھتی تھیں ۔ غالب زمانے کے ذمہ خدوہ تھے ۔
 ان کی زندگی میں باوجود سنگٹشل اور شادابی ' تیزی اور تندی ' جھلنی اور
 طرازی کے ایک سنگٹنے والی کیفیت تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے
 اس صوبہ حالات کی مناسبت سے خون ، آگ ، دھواں اور شر
 وخیو کے نئے اشاروں اور علامتوں سے کام لیا اور ان کے ذریعے
 سے اپنے فنی میں انفراد ابلاغ کا ایک نیا عالم پیدا کیا ۔ پھر ایک
 بات یہ بھی ہے کہ اپنی اس ذہنی کیفیت کے باوجود وہ زندگی سے
 بایکس نہیں تھے ۔ ان کی نگاہیں تو ایک نئی دنیا کے پیدا ہونے کا
 منظر دیکھ رہی تھیں ۔ چنانچہ اس صوبہ سال نے انہیں سحر ، زنبیر ،
 خواب ، بیداری ، تسارے ، آہتاب اور اسی طرح کے بہت سے
 اشاروں اور علامتوں کی تخلیق کی طرف راغب کیا ۔ اور ان علامتوں اور
 اشاروں میں ایسا جادو تھا کہ غالب کے بعد اردو شاعری میں ان
 کے استہلال کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا ۔ اور موجودہ دور میں جدید
 سے جدید اردو شاعروں نے ان سے انفراد ابلاغ کے سلسلے میں

بڑے بڑے کام تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو شاعری کی دُنسیا ہی
جبل گئی۔

یہ سب کچھ غالب کا فنی کا نام نہ تھا۔ انہوں نے اردو شاعری
میں علامت نگاری کو ایک اسلوب کی حیثیت سے مستقل حیثیت
دی اور نہ صرف ابلاغ بلکہ جالیاتی انداز کے لئے بھی اس کو اس
طرح استعمال کیا کہ اردو شاعری میں اس نے ایک رجحان کی حیثیت
اختیار کر لی اور غالب جالیاتی انداز کے لئے اس رجحان کو برتنے
اور عام کرنے میں اس وجہ سے کامیاب ہوئے کہ وہ اس کی اہمیت
کا گرا شعور رکھتے تھے۔ اور ان کے خیال میں ناز و غمزہ کی بات
دشمنہ و خنجر میں اور مشاہدہ حق کی گفتگو باوہ و ساغر میں کرنا
شاعر کے لئے ناگزیر ہے۔

غالب نے اپنے فنی میں رمزیت اور ایمائیت کے ایک نئے
انداز کو وجود میں لانے کا تجربہ بھی کیا ہے۔ غالب سے متسل
اردو شاعری میں رمز و ایما کی روایت تو موجود تھی لیکن اس میں
بانیوں نہیں تھا جو ان کے اہتوں پیدا ہوا۔ وہ تہہ داری کی کیفیت
بہت تھی جو ان کے اہتوں وجود میں آئی۔ غالب نے اپنے منکر
کی نسبت سے اس رمز و ایما کو زیادہ تہہ دار بلکہ کسی حد تک
پرچہ دار بنا دیا اور اس طرح اس کی حدیں ابھام سے جا میں۔
یہ ابھام آج کی شاعری کے لئے ایک اسلوب کی حیثیت رکھتا
ہے۔ غالب نے آج سے سو سال قبل اس ابھام کو ایک اسلوب
بنا دیا۔ لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ ابھام کو انہوں نے اپنے حدود

میں دکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بیان بہام سے زیادہ اس کی لطافت کا احساس ہوتا ہے اور جو ابہام ان کے بیان نظر آتا ہے اس کو ایک لطیف ابہام کہنا چاہئے۔ یہ لطیف ابہام اس رمزیت اور ایمائیت ہی کی ایک رقی یا نثر شکل ہے جس کو غالب نے بڑی باکدستی کے ساتھ اپنے فن میں بتا ہے۔

اس رمزیت، ایمائیت اور لطیف ابہام کی وجہ سے اردو شاعری کو ایک نیا اسلوب ملا۔ یہ اسلوب غالب کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور ان کا فن اس اسلوب ہی سے پہچانا جاتا ہے۔ اس اسلوب نے انہیں اپنے زمانے میں بڑی حد تک اجنبی بنا دیا۔ اور اسی لیے وہ اس زمانے میں عام نہ ہو سکا۔ شاید اس وجہ سے کہ غالب ایک عظیم شاعر اور فن کار کی حیثیت سے اپنے زمانے سے قطعاً بنا موصول قبل پیدا ہوئے۔ وہ اپنے زمانے میں خاموش رہتے۔ انہیں موجودہ دور میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔ اُن کا احساس دشواری اور مالیاتی اظہار موجودہ دور سے مناسبت رکھتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ موجودہ دور میں اس اسلوب نے تقریباً تمام جدید شاعروں کے دلوں میں اپنی جگہ بنائی اور ان کے فن کا عام مسودہ یہی اسلوب قرار پایا۔ اس اعتبار سے غالب کی حیثیت ایک ایسے پہاڑ کی ہے جس کے دامن میں ہر مدش پانے والی ہر چیز اس کی محفوس آب و ہوا سے متاثر ہوتی ہے۔

زبان و بیان کو غالب نے ہر ذات خود ایک فن بنا دیا ہے۔ زبان اس میں شبہ نہیں کہ اظہار کا ذریعہ ہے لیکن ایک عظیم شاعر

کے ہاتھ میں اس کی حیثیت ایک فن کی ہوتی ہے۔ ایک ایسا فن جو انھار و ابلاغ کے ساتھ ساتھ حسن و جمال کے نور کو بکھیرتا ہے اور شاعری میں ایک چراغاں کی سی کیفیت کو پیدا کرتا ہے۔ غالب نے زبان میں ایک استہادی شان پیدا کی ہے۔ اس کو رنگین اور پرکار بنایا ہے۔ اس میں گل ہوئے سے کھائے ہیں۔ اس میں ایک عیب طرح کی گجگٹا ہٹ اور تابانی سما پیدا کی ہے۔ اس کو ہر سبکی طرح تراشا ہے۔ اس میں نئے رنگ بکھرے ہیں۔ نئے پہلو پیدا کئے ہیں۔ الفاظ کو آسان پر بکھرے ہوئے ستاروں کی طرح یک جا کیا ہے۔ اس میں تزیین و آرائش نہیں ہے۔ نعوت کا حسن زبان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حسن کی نعوت اس میں قدم قدم پر اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ غالب نے زبان کی اصلاح نہیں کی ہے۔ لیکن ایک نئی زبان کو پیدا کیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کی یہ زبان عام لوگوں کی زبان نہیں۔ اس میں ایک ادبی رنگ و آہنگ ہے۔ اور اس کو صبح سمنوں میں شاعری کی زبان کہا جا سکتا ہے۔ غالب سے قبل شاعری کی زبان میں یہ ادبی رنگ و آہنگ کم تھا۔ وہ جوئے کی زبان سے زیادہ قریب تھی۔ غازی کے اثرات غالب کی پیدا کی ہوئی زبان میں غالب ہیں۔ لیکن ان اثرات کو پیدا کرنے میں ان کی کسی شہسوی کشش کو دخل نہیں تھا۔ غازی تو ان کے مزاج کا جز تھی۔ اس کا رنگ تو ان کی شخصیت میں رچا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غازی کا رنگ و آہنگ ان کی زبان میں اجنبی اور نامائوس نہیں معلوم ہوتا۔ برخلاف اس کے کہ تو اس تہذیب کی تمام رنگینوں اور رضائیوں کو سامنے لا کر

کر دیتا ہے۔ جس نے غاب کو پیدا کیا تھا۔ اور جس کی رنگینیاں اور
رہنمایاں ان سے قبل کئی سو سال تک اس سرزمین پر رنگ بکھیرتی
رہی تھیں۔

غاب نے اُردو شاعری کو ایک ایسی زبان دی جو صرف رنگیں
اور پُرکار ہی نہیں تھی۔ اس میں احساس کی شدت، جذبے کی صداقت،
شعور کی گہرائی، فکر کی گیرائی اور نثریے کی پختگی کے کئی اظہار و ابلاغ
کی بڑی صلاحیتیں تھیں۔ غاب کی شاعری انہیں تمام عناصر سے مبلت
تھی۔ چنانچہ یہی عناصر اس مخصوص زبان کی تخلیق کے محرک ہوئے جو
غاب کا ایک اجماعی کارنامہ ہے۔ گذشتہ سو سال میں اردو کے
ان تمام شاعروں کے یہاں یہ زبان اپنی جگہ دکھاتی ہے جن کی شاعری
میں احساس کی شدت، جذبے کی صداقت، شعور کی گہرائی، فکر کی
گیرائی اور نثریے کی پختگی کا امتزاج صحیح ہایاتی اظہار کا تقاضا کرتا ہے۔
(میں نے) کاؤسے دیکھا جائے تو غاب جدید شاعری اور اس
کے مختلف نئی رہنمائی اور ہایاتی سہائات کے پیش رو نظر آتے ہیں۔
اور ان کے فن اور ہایاتی اجماع کے اثرات کا رنگ و آہنگ نہ صرف
جدید شاعروں کی شاعری پر اعلیٰ درجے کے نثر نگاروں کی نثری تخلیقات
میں بھی اپنی جگہ دکھاتا ہے۔

عزیز غاب بڑے ہی پہلو دار فن کار تھے۔ اُردو شاعری
میں وہ ایک اداسے خاص سے نکتہ سرا ہوئے اور ان کا فن پارا
نکتہ دان کے لئے صلائے عام کا پیغام ثابت ہوا۔ آئندہ نے اپنے فن
سے ہایاتی اقدار کی نئی دنیا بھی پیدا نہیں کی، ان اقدار کو موجود

دور کے مزاج کا تجزّہ بنا دیا۔ چنانچہ موجودہ زمانے میں غالب کے فن کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی دوسرے شاعر کے فن کو حاصل نہ ہو سکی۔ دورِ جدید میں مختلف خیالات و نظریات اور مختلف اسبابِ اندازِ بیان رکھنے والے شاعروں اور ادیبوں کو جن طرح غالب کے فن نے متاثر کیا ہے شاید کسی دور میں کسی دوسرے فن کار نے اس طرح متاثر نہیں کیا۔

اس لئے شاید یہ کہنا ہے جانیں کہ اردو شاعری کی روایت میں غالب کے فن کی حیثیت وہی ہے جو خیرِ نوائی اعتبار سے کسی ملک میں ایک سرِ بھگ پھاڑ کی ہوتی ہے۔

اوائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارِ این نکتہ دان کے لئے



ن

د

زبان : ۲۴، ۱۹، ۲۵، ۲۱، ۲۳، ۲۲

طافیت : ۱۴۲

۲۳، ۲۲، ۲۳، ۲۲، ۲۳، ۲۳، ۲۳، ۲۳

دیوان غالب (مکمل) : ۱۹۲، ۸۳

زبان و بیان : ۲۱، ۲۵، ۱۹

ط

زمین و زمین : ۸۹

ڈیو برکس (سی) : ۲۱۵

س

ذ

سادگی : ۶۰

ذوق : ۲۵

سدا : ۲۲۱

س

سید احمد بریلوی (مکمل) : ۲۱

روایت : ۹۵

مشق

روایت و توانی : ۹۵، ۹۶

شاعری غالب : ۱۶۰

عزیمت : ۱۹، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹

شاعرانہ تجربہ : ۸۳

۱۹۳، ۱۵۲

شاعری : ۷۱

روایت : ۹، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴

شاعرانہ فن کاری : ۷۱

۲۴۰، ۲۴۹

شاعری کی زبان : ۱۲۱

روایت اور بنیاد : ۲۴۷

شاهجہانی سدا : ۲۰، ۱۹

روایت کے اشارات : ۲۴۷

شاہ نصیر : ۲۵

سوانہ بندی : ۲۷

شخصیت : ۲۷۰

روایت : ۵۶، ۷۲

س

روایت : ۲۷

سوق آجگ : ۲۶۱

روایتی فن کاری : ۲۸

ریڈ (بربرٹ) : ۱۵۶

ط

طریق جنگ: ۱۲۳، ۱۲۸

طرز: ۱۲۴، ۱۲۶

طرز مزاج: ۱۲۴، ۱۲۶

ظ

ظرافت: ۱۲۴، ۱۲۷

ظہوری: ۱۲۶، ۱۲۷

ح

حرف: ۱۲۱، ۱۲۶

حشمت عاشق: ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۴، ۲۵

۱۲۴، ۱۲۸

حفت: ۱- ۱۲، ۲۵

حالات: ۱۶، ۱۶۷، ۲۷۲

حالات و اشارات: ۱۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹

۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳

حالات پسندی: ۱۴۷

حالاتی: ۱- ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴

۱۴۷، ۱۴۸

روایت کے اشارات: ۱۰۵، ۱۱۲، ۲۱۲

رمزیت ایمانیات: ۱۳۷، ۱۴۳

زبان و بیان: ۲۱۷، ۲۶۲

غ

اولیٰ و اصل: ۲۲، ۲۳

اردو کا وسیع کا استعمال: ۲۳۸، ۲۳۹

اسیری: ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۱۷۱، ۱۷۲

۱۷۲

انسان انسانیت: ۲۳، ۲۴

احبت: ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶

اک عظیم شاعر: ۷

پند و برد: ۷۸

تذیب کی پیداوار: ۱۷۰

حسن و حسن چستی: ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳

۱۴۴

شاعری کی زبان: ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳

۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴

شفقت: ۱۹۰، ۱۹۱

علامات و اشارات: ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳

فارسی شاعری کی روایت: ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹

فکری سفر: ۲۸

فی: ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷

۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵

۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶

موضوعات: ۱۳۲، ۱۴۱

وزن و آہنگ: ۱۰۳، ۱۰۴

غزل کی روایت: ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷

۱۴۳

نفاہیت: ۲۴۳

ف

فارسی اور اردو زبان: ۲۴۴، ۲۴۵

(انصال و اشتراح)

فارسی شاعری: ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸

۲۴۹، ۲۵۰

نثر و شعر: ۶۱

نثری آہنگ: ۷۰

نثری صنف: ۲۸، ۲۹

نفسیاد افانہ: ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸

نفسیاد تخیلی: ۱۳۵، ۶۱

نفسیاد میلان: ۱۲۰، ۱۲۱

نثر: ۲۳، ۲۴، ۶۷

نثری روایت: ۱۴، ۱۵، ۱۶، ۱۷

ک

کار و بار شوق: ۵۴

کولج: ۱۴۰، ۱۴۱

گ

گوشے: ۲۱۶، ۲۱۷

ل

لال نگر: ۲۱

لہجہ: ۲۵۴، ۲۶۰

م

مترجم کیفیت: ۱۹۶، ۲۴۴

مزاج: ۱۲۴

مزامیر اور فنی افانہ: ۲۶۶

معنی: ۲۲۲، ۲۲۳

مظاہر قدرت: ۳۵

مغزلوں کا دورِ آخر: ۲۰، ۲۱

موسیقیت: ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱

۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷

موضوعات: ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴

موضوعات کا تنوع: ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶

موتی: ۲۶، ۲۷

میر: ۲۲، ۲۳، ۲۴

میر کی روایت: ۲۳

ن

ناسخ: ۲۲، ۲۳

نسل: ۲۲۳

نسل برزی: ۲۵

نشاہد رنگ: ۲۲، ۲۳، ۲۴

۲۸، ۳۸، ۵۵، ۶۶

نقیری: ۲۹، ۶۶

ننگل: ۸۳، ۸۸، ۸۹، ۹۳، ۹۴

۲۲۵

و

ورد سدا: ۸۲

وزن رنگ: ۴۱، ۴۲، ۸۲

۹۳، ۶۶، ۶۳

ولیم ایسن: ۱۵۶

ھ

ھریٹ ریڈ: ۱۵۶

ھم آہنگی: ۳۱، ۳۲، ۳۳

ی

یئیس (ڈبلیر-بی): ۱۲۲

ڈاکٹر عبادت بریلوی کی کتابیں

۱۔ اُردو تنقید کا ارتقاء	۱
۲۔ تنقیدی زاویے	۲
۳۔ روایت کی اہمیت	۳
۴۔ غزل اور مطالعہ غزل	۴
۵۔ خطبات عبدالحق	۵
۶۔ مقدمات عبدالحق	۶
۷۔ تنقیدی تجربے	۷
۸۔ شاعری اور شاعری کی تنقید	۸
۹۔ جدید شاعری	۹
۱۰۔ مومن اور مطالعہ مومن	۱۰
۱۱۔ کلیات میراج مقدمہ	۱۱
۱۲۔ سحر البیان — تنقیدی مطالعہ	۱۲
۱۳۔ غالب اور مطالعہ غالب	۱۳
۱۴۔ غالب کا فن	۱۴
۱۵۔ اقبال کی اُردو نثر	۱۵
۱۶۔ اقبال — احوال و افکار	۱۶
۱۷۔ میر تقی میر — حیات اور شاعری	۱۷
۱۸۔ جہان میر (ادبی سوانح)	۱۸

۱۹	_____	ولی اورنگ آبادی
۲۰	_____	حضرت خواجہ میر درد دہلوی
۲۱	_____	نالدہ، خواجہ میر درد دہلوی
۲۲	_____	خطوط عبدالحق بنام ڈاکٹر عبادت
۲۳	_____	افسانہ اور افسانے کی تنقید
۲۴	_____	ادب اور ادبی قدریں
۲۵	_____	تنقید اور اصول تنقید
۲۶	_____	جشنِ اقبال نئی دہلی
۲۷	_____	جشنِ نامہ اقبال (اُردو)
۲۸	_____	جشنِ نامہ اقبال (انگریزی)
۲۹	_____	پاکستان کے تنذیبی مسائل
۳۰	_____	نزدان شوق (غاکے)
۳۱	_____	آوارگانِ عشق
۳۲	_____	جلوہ ہائے صدرنگ
۳۳	_____	یارانِ دیرینہ
۳۴	_____	شجرہائے سایہ دار
۳۵	_____	ڈاکٹر گلکرسٹ کی نقلیں (انگریزی)
۳۶	_____	مؤاز دانش (حیدری)
۳۷	_____	دیوانِ دلا
۳۸	_____	دیوانِ حیدری
۳۹	_____	ارضِ پاک سے دیارِ فرنگ تک
۴۰	_____	ترکی میں دو سال
۴۱	_____	دیارِ حبیب میں چند روز

جہانِ غالب



ڈاکٹر عبادت بریلوی

کی

نئی کتاب جس میں غالب کی زندگی کے حالات ،
اُن کی شخصیت ، ماحول ، تصانیف اور اُن کے فکرو فن
کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔



ملنے کا پتہ
ادارۂ ادب و تنقید
۸۸- این، سمن آباد، لاہور



ڈاکٹر عبادت بریلوی

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ ہی میں حاصل کی۔ اور لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔ اے آفرز، ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ ۱۹۴۴ء میں اینگلو عربک کالج دہلی یونیورسٹی میں صدر شعبہ اردو مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۹ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور میں اردو زبان اور ادب کے استاد کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ ۱۹۶۲ء میں لندن گئے

اور اسکول آف اورینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز یونیورسٹی آف لندن کے شعبہ ثقافت ہند و پاکستان میں پانچ سال تک اردو زبان و ادب کے استاد اور ادبی تحقیق کے نگران کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ۱۹۶۶ء میں وطن واپس آئے۔ آجکل پنجاب یونیورسٹی لاہور میں اردو کے پروفیسر اور صدر شعبہ ہیں۔

تصانیف

- (۱) تنقیدی زاویے (۲) اردو تنقید کا ارتقا (۳) روایت کی اہمیت
- (۴) غزل اور مطالعہ غزل (۵) تنقیدی بھرپے (۶) جدید شاعری (۷) مومن اور مطالعہ مومن (۸) شاعری اور شاعری کی تنقید (۹) غالب اور مطالعہ غالب (۱۰) غالب کا فن (۱۱) خطبات عبدالحق (۱۲) مقدمات عبدالحق (۱۳) کلیات میر (۱۴) شکستہ—کافم علی جوان (۱۵) ہفت گلشن مظہر علی خاں ولا (۱۶) مادھونل اور کام کندلا—مظہر علی خاں ولا (۱۷) مختصر کہانیاں—سید حیدر بخش حیدری (۱۸) دیوان حیدری (۱۹) تذکرہ حیدری (۲۰) گازار چین—خلیل علی خاں اشک (۲۱) رسالہ کائنات—خلیل علی خاں اشک (۲۲) چار گلشن—بینی نرائن چھاں (۲۳) دیوان مبتلا—عبید اللہ خاں مبتلا (۲۴) ممتاز الامثال—نواب فیض علی خاں ممتاز (۲۵) انتخاب خطوط غالب (۲۶) سرائی جرأت (۲۷) ارض پاک سے دیار لرنگ تک۔